لاڑکانہ کے چہار درویش
کامریڈ سید جمال الدین بخاری
کامریڈ حیدر بخش جتوئی
کامریڈ مولوی نذیر حسین جتوئی
کامریڈ سوبھو گیان چندانی
مسلم شمیم

اپنی جنم بھومی کے لیے عشق میں ڈوبے ہوئے اور محبت سے سرشار لفظ تو میں نے بھی کبھی اِس طرح نہیں لکھے جس طرح مسلم شمیمؔ صاحب نے لاڑکانہ کے لیے اپنی محبت کا اظہار کرتے ہوئے لکھے ہیں۔ یہ اظہار اُنھوں نے اپنی کتاب 'لاڑکانہ کے چہار درویش' کے پہلے اڈیشن کا انتساب خالد چانڈیو (لاڑکانہ کے ایک اور پریمی) کے نام کرتے ہوئے کیا ہے۔ اپنی جائے پیدائش سے تو آپ جتنی محبت جتائیں، وہ فطری ہوتی ہی ہے، لیکن اپنی جنم بھومی کے علاوہ کسی اور جگہ کو ''گیان'' بھومی گردانتا اور ''پریم'' بھومی ماننا، عشق کی کوئی اور ہی منزل ہے۔ بات جب ''گیان'' کی ہو تو سمجھ میں آجاتا ہے کہ آپ کی فکر اور سوچ کا منبع وہیں سے پھوٹا ہے، کوئی ہے جس نے آپ کو اپنے علم اور فکر و دانش کا اسیر بنا رکھا ہے۔ مسلم شمیمؔ صاحب کی یہ اسیری اور عشق کی سرشاری اُس وقت عیاں ہو جاتی ہے جب وہ لاڑکانہ کے اُن نابغۂ روزگار، بے غرض عام لوگوں کے دُکھوں سے واقف اور خدمتِ خلق کے جذبے سے سرشار چار غیر معمولی شخصیات کا ذکر اِس کتاب میں کرتے ہیں۔ آپ کے ہاتھ میں 'لاڑکانہ کے چہار درویش' کا یہ یہ دوسرا اڈیشن ہے۔ میری خوش بختی ہے کہ مسلم شمیمؔ صاحب نے اِس کتاب کے بارے میں مجھے کچھ لکھنے کی دعوت دے کر میری عزت افزائی فرمائی۔ ۲۰۱۳ء میں پہلی دفعہ شائع ہونے والی یہ کتاب کامریڈ سید جمال الدین بخاری، کامریڈ حیدر بخش جتوئی، کامریڈ مولوی نذیر حُسین جتوئی اور کامریڈ سوبھو گیان چندانی کے بارے میں معلومات کا خزانہ لیے ہوئے ہے۔ اِن چار شخصیات میں مصنف کو ایسی کیا قدرِ مشترک نظر آئی کہ وہ اُن کی نظر میں لاڑکانہ کے اور بہت سے مقتدر، صاحبِ علم اور بے لوث لوگوں میں سب سے قد آور نظر آئے؟ جو خصوصیات مسلم شمیمؔ صاحب کو اِن درویش صفت لوگوں میں نظر آئیں، وہ ہیں اِن کی انسان دوستی، سماجی ناانصافیوں اور مذہب کے نام پر ظلم و استحصال کے خلاف اِن کی مسلسل جد و جہد، طبقاتی فرق اور اِس کے خلاف لوگوں میں بیداری پیدا کرنا، غربت و افلاس کو تقدیر کا لکھا نہ سمجھنا بلکہ اُس میں سے نکلنے کی شعوری کوشش کرنا، جہل اور توہم پرستی کی دلدل سے لوگوں کو باہر نکالنے کی سبیل کرنا۔ یہ سب کچھ محض کہنے کی حد تک نہیں تھا بلکہ اِن غیر معمولی لوگوں نے اپنی پوری زندگی اِس کے لیے وقف کر دی تھی۔ کامریڈ سید جمال الدین بخاری نے عملی جد و جہد کرتے ہوئے بار بار جیل یاترا کی۔ وہ برطانوی سامراج سے نبرد آزما رہے، اُنھوں نے بے شمار ادبی اور سیاسی تنظیمیں بنائیں اور اُنھیں خوش اسلوبی سے چلا کر دکھایا۔ بھارت کے صوبے گجرات کے شہر احمد آباد میں پیدا ہونے والے کامریڈ سید جمال الدین بخاری اپنی سیاسی زندگی کے نشیب و فراز سے گزرتے ہوئے کراچی پہنچے اور پھر اپنے علی گڑھ اے۔ ایم۔ او۔ کالج کے ہم جماعت اور دوست قاضی فضل اللہ کے مشورے پر ۱۹۴۹ء میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ لاڑکانہ منتقل ہوئے۔ لاڑکانہ کی سرزمین نے اُنھیں اپنی محبت میں کچھ ایسا جکڑا کہ اپنی زندگی کے ۳۶ سال اُنھوں نے وہیں گزار دیے، بہت سے ادارے تشکیل دیے جن میں سے بعض کے وہ تاحیات سرپرست رہے۔ اُن اداروں میں ادبی، عوامی بہبود اور رفاہِ عامہ کے ادارے شامل تھے۔ اپنی زندگی کی آخری سانسوں تک وہ متحرک رہے اور پھر لاڑکانہ کی مٹی اوڑھ کے سو گئے۔ اِسی طرح سندھ کی ایک اور کرشماتی شخصیت کامریڈ حیدر بخش جتوئی کی زندگی کا بیان تو دیکھیے کہ آج کے دور میں جب دو کوڑی کی نوکریوں پر لوگوں کے ایمان کو بکتے دیکھا گیا ہے، وہاں اُنھوں نے ۱۹۴۵ء میں انگریزوں کی حکومت کے اعلیٰ سرکاری عہدے ڈپٹی کلکٹری سے استعفا دے کر ''ہاری کمیٹی'' کی باگ ڈور سنبھال کر اُس کو سندھ کے کونے کونے میں پہنچا دیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ سندھ کی ہر تکلیف پر تڑپ جانے والے ہاریوں کے حقوق کی لڑائی لڑنے کے ساتھ سندھ کی وحدت کے خلاف وَن یونٹ کو ختم کرنے کی تحریک میں بھی پیش پیش نظر آتے ہیں۔ سندھ کی محبت اور شان میں اُن کے تخلیق کردہ اشعار سندھی ادب کا ایک بڑا سرمایہ ہے۔ کامریڈ حیدر بخش جتوئی نے کسانوں کے حقوق کے لیے جو جد و جہد کی، وہ سندھ کی تاریخ کا ایک زریں باب ہے، لیکن کامریڈ حیدر بخش جتوئی کی خدمات کے اعتراف میں سندھ کی طرف سے جو منصب اُن کو ملنا چاہیے تھا، وہ اب تک اُنھیں نہیں مل سکا ہے۔ اسی طرح ہماری نئی نسل کامریڈ مولوی نذیر حُسین جتوئی کو کتنا جانتی ہے؟ کتنوں کو معلوم ہے کہ 'مولوی' کے ساتھ 'کامریڈ' کہلانے والے اِس عالم کی حق گوئی کتنی آشکارا تھی اور وہ پیر پرستی اور توہم پرستی کے کتنے خلاف تھے؟ بقول مسلم شمیمؔ صاحب کے، وہ ایک سیکولر عالم اور دانش ور تھے۔ وہ بھٹو کے 'روٹی، کپڑا اور مکان' کے نعرے کو محض نعرہ اور عوام کو افیون کی گولی کھلانے کے مترادف سمجھتے تھے۔ اسی طرح محمد ایوب کھوڑو اور قاضی فضل اللہ کی سیاست کو بھی اُنھوں نے عوام کے حق سے متصادم جانا۔ سوبھو گیان چندانی کی شخصیت پر اُنھوں نے اپنا طویل مقالہ لکھ کر سوبھو گیان چندانی کو عظیم مارکسی نظریہ داں مفکر، انقلابی دانش ور، ادیب و تخلیق کار اور سیاست داں کے طور پر متعارف کروایا۔ اِن چاروں شخصیات میں مشترک حوالہ لاڑکانہ کی مردم خیز زمین سے اِن کا تعلق ہونا ہے، بلکہ یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ ایسی ہی دیگر کئی شخصیات نے بھی لاڑکانہ کو ایک وقار بخشا ہے۔

سب کہاں! کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں　　　خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

مہتاب اکبر راشدی

# لاڑکانہ کے چہار درویش

درویشی و انقلاب مسلک ہے مرا
صوفی مومن ہوں ، اشتراکی مسلم

(مولانا حسرت موہانی)

# لاڑکانہ کے چہار درویش

- کامریڈ سید جمال الدین بخاری
- کامریڈ حیدر بخش جتوئی
- کامریڈ مولوی نذیر حسین جتوئی
- کامریڈ سوبھو گیان چندانی

**اشاعتِ ثانی مع ترمیم و اضافہ**

مصنف: مسلم شمیم

پیش کش

**سلیم صدیقی**

جنرل سکریٹری: لاڑکانہ سنگت، کراچی

| | | |
|---|---|---|
| نامِ کتاب | : | لا زمانے کے چہار درویش |
| مصنف | : | مسلم شمیم |
| مصوریِ سرورق | : | نقش پبلیکیشنز |
| کتابت و تصحیح | : | ایضًا |
| مطبع | : | البرکہ، کراچی |
| اشاعتِ اول | : | ۲۰۱۳ء |
| اشاعتِ ثانی | : | ۲۰۱۷ء |
| تعدادِ اشاعت | : | ایک ہزار |
| قیمت | : | ۳۵۰ روپے |
| ملنے کے پتے | : | ویلکم بک پورٹ، اردو بازار، کراچی |
| | | مکتبہء دانیال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی |
| | | تھامس اینڈ تھامس، ریگل چوک، صدر، کراچی |
| | | توکل اکیڈمی، اردو بازار، کراچی |

نقش پبلیکیشنز

۵۰۵، فیز۲، رفیق پلازا، بالمقابل ماما پارسی سکول، نزدِ سعید منزل

ایم۔ اے۔ جناح روڈ، کراچی۔ ۲۰۲۷۲۰۲-۱۳۳۰-۲۰۲

naqshpublications@yahoo.com

# انتساب

## شاہ محمد مسعود ایڈوکیٹ کے نام

(۱۴رمئی ۱۹۱۸ء - یکم نومبر ۱۹۷۵ء)

جن سے مل کر زندگی سے عشق ہو جائے، وہ لوگ
آپ نے شاید نہ دیکھے ہوں مگر ایسے بھی ہیں
(سرورؔ بارہ بنکوی)

مسلم شمیم

شہرِ لاڑکانہ کو میں اپنی گیان بھومی اور پریم بھومی کہتا ہوں۔ اِس شہر کی ایک گراں مایہ اور کثیرالصفات شخصیت مرحوم شاہ محمد مسعود ایڈوکیٹ کی تھی جن سے میری قربتوں اور مختلف النوع سماجی رابطوں کی ایک بڑی کہانی ہے جو میں مستقبلِ قریب میں کتابی صورت میں پیش کرنے کی نیت رکھتا ہوں۔

۱۹۶۰ء میں پہلے پہل میرا لاڑکانہ آنا ہوا اور یہاں کی تاریخی ادبی تنظیم 'بزمِ ادب' کے مشاعرے میں میری اُن سے ملاقات ہوئی جو خلوص و محبت کے رشتوں کا وسیلہ بنی، اور ۱۹۷۵ء یعنی اُن کے سالِ وفات تک مذکورہ رشتوں کی گہرائی و گیرائی میں اضافہ ہوتا گیا۔ اُن کی وفات کی خبر سے جو صدمات لاحق ہوئے تھے، اُن کی کسک مجھے لمحۂ موجود میں بھی محسوس ہو رہی ہے اور قلم کربِ ارتعاش سے دوچار ہے۔

اپنے محترم مرحوم دوست کو چند جملوں میں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ وہ شہرِ لاڑکانہ کی ہر طرح کی سماجی اور ثقافتی سرگرمیوں کے حوالے سے نمایاں ترین شخصیت تھے۔ میرے لیے وہ ایک شجرِ سایہ دار کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ ایک انتہائی وسیع النظر اور روشن خیال انسان تھے، لہٰذا تفاوتِ عمری کے باوجود ہماری قربتوں اور باہمی ربطِ خاص میں کبھی کمی نہیں آئی، میری ترقی پسندی اور بائیں بازو سے وابستگی بھی اُن کے لیے کبھی سوالیہ نشان نہیں بنی۔ اپنی کم گوئی کے باوجود وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے، نہایت خوش خلق اور دلِ دردمند رکھنے والے شخص تھے۔ وہ شہر کے معروف ترین وکلا میں شمار ہوتے تھے اور اُن کے مجموعی کردار کی شفافیت اُن کا وصفِ خاص تھی۔ من حیث المجموع وہ ہر زاویے سے ایک اجلے انسان تھے۔

# ترتیب

## مسلم شمیم

# حرفِ اول

زیرِ نظر کتاب 'لاڑکانہ کے چہار درویش' میں جن چار شخصیتوں کی جد و جہد سے عبارت حیات کی روداد اجمالاً بیان کی گئی ہے، یہ چاروں ہستیاں جامعیت اور کثیرالجہتی کی حامل آدرش وادی شخصیات ہیں۔ اِن کا آدرش انسانیت دوستی کے نقطۂ عروج سے شروع ہو کر سماج کی طبقاتی جد و جہد پر منتج ہوتا ہے۔ یہ سماج کی اُن بنیادوں کی بیخ کنی کرنا چاہتی تھیں جو دھرتی پر جبر و استحصال کا سرچشمہ تھیں، اور اِس مشن میں اِنھوں نے اپنی زندگی کا بیش تر حصہ صرف کیا۔ اِن پر وہ زمینی حقائق روزِ روشن کی طرح منکشف تھے کہ سماج میں انسانوں کی بھاری اکثریت غربت و افلاس، جہل اور توہم پرستی میں کب سے اور کیونکر مبتلا ہیں۔ وہ سماجی ناانصافیوں اور بھیانک ناہمواریوں کو مشیتِ ایزدی تسلیم کرنے کو تیار نہ ہوئے جو مذہب کے نام پر ظلم و استحصال کی وکالت کرنے والے حلقوں کا موقف رہا ہے اور جو لوگوں کو جبرِ تقدیر کا یقین دلا کر صبر و قناعت کی تلقین کرتے

آئے ہیں۔ اِن شخصیات کے ادراک وشعور میں یہ حقائق رچے بسے تھے کہ انسان جو لاکھوں برس سے اِس دھرتی پر آباد ہے، ہمیشہ سے اُس کی سماجی زندگی ایسی نہ تھی بلکہ نجی ملکیت کے ظہور پذیر ہونے سے پہلے کے ادوارِ تاریخ میں انسان کو ہر قسم کی آزادی حاصل تھی۔ یہ عرصۂ تاریخ جسے ابتدائی اشتراکیت کا معاشرہ (PRIMITIVE COMMUNIST SOCIETY) کہا گیا ہے، اِس سماج میں کوئی اونچ نیچ نہیں پائی جاتی تھی یہ دور ہزاروں سالوں پر محیط رہا ہے۔ نجی ملکیت کے ظہور پذیر ہونے کے بعد سے سماج دو طبقوں میں تقسیم ہوتا چلا گیا، استحصال کرنے والے اور استحصال کا شکار ہونے والے طبقات، یعنی ظالم اور مظلوم طبقات۔ واضح رہے کہ ظالم طبقہ ایک مختصر اقلیت میں رہا ہے، مگر اپنے استحصالی ہتھکنڈوں کے ذریعے اُس نے مظلوم عوام کو عقائد اور مذاہب سے لے کر ہر قسم کے مکر وفریب میں مبتلا رکھا ہے۔ غلامی کے نظام کو بھی مشیتِ ایزدی قرار دے کر غلاموں کو آقاؤں کی خدمت پوری وفاداری سے کرنے کا درس دیا گیا۔ اِس میں اُن کی عاقبت کی خیر بتائی گئی اور جنت الفردوس کی بشارتیں دی گئیں۔ موروثی بادشاہتوں کے ادوار میں بادشاہ کو خدا کا نائب بتایا گیا اور اُن کی اطاعت کو ذریعۂ نجات وفلاح قرار دیا گیا۔ تاریخ نے اپنے سفرِ ارتقا میں غلامی کے نظام کو وحشت و بربریت اور شرفِ بشر کی نفی قرار دیا۔ گزشتہ چند صدیوں سے انسانی سماج ماضی کی بیش تر ظلم و جبر کی زنجیروں کو پاش پاش کرنے کا معرکہ سرکرنے میں مصروف ہے اور دھرتی پر موجود جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ تسلط کی بیخ کنی کرنے کے لیے سرگرداں ہے۔ انقلابِ فرانس ۱۷۸۹ء کے بعد سے روسو اور والٹیر کے افکار ونظریات جمہوری طرزِ احساس کی آبیاری کرتے آئے ہیں، اور LIBERTY, EQUALITY AND FRATERNITY، یعنی آزادی

مساوات اور اخوت آج انسان کا MIND-SET بن چکے ہیں۔ انیسویں صدی میں جمہوری انقلابات کے تسلسل کے ساتھ آغاز اور ۱۸۴۸ء میں مارکس اور اینگلز کے کمیونسٹ مینی فسٹو نے تاریخ کے دھارے کو نہ صرف از سرِ نو CHANNELIZE کیا بلکہ دھرتی پر محنت کشوں کی حکومت کے قیام کی نظریاتی سمتیں بھی طے کر دیں اور انقلابات کے خد و خال کی نشاں دہی بھی کر دی۔ اِس سلسلے کے انقلاب کا نقشِ اول ۱۸۷۰ء میں پیرس کمیون کی شکل میں ابھرا اور تاریخ کے بہت مختصر عرصے کی عمر پا کر وہ نقش تاریخ سے محو نہیں ہوا بلکہ انسانی شعور کو سوچ اور عمل کے نئے زاویے دے گیا۔ ۱۸۸۶ء کے شکاگو کے سانحے نے عالمی مزدور تحریک کو جنم دیا۔ ۱۹۱۷ء میں روس میں انقلابِ اکتوبر اور ۱۹۴۹ء میں چین میں اشتراکی انقلاب یہ سب کچھ سماجی ارتقا کے وہ مراحل ہیں جن کے سبب تاریخ کا سفر اب تیزی سے ارتقا پذیر ہے، اور ۱۹۴۸ء میں تشکیل شدہ اقوامِ متحدہ کا حقوقِ انسانی کا اعلان نامہ (CHARTER OF HUMAN RIGHTS)، جو آج انسانی خواب ہے، اُس کی تعبیر انسان کے مستقبل کا مقدر ہے۔

اِس کتاب 'لاڑکانہ کے چہار درویش' کا آدرش، خواہ وہ ہماری تحریک یا قومی آزادی کے حوالے سے رہا ہو، دراصل انسان کو ہر قسم کی استحصالی زنجیروں سے نبرد آزمائی اور اُن کی شکست و ریخت کے لیے علمِ انقلاب بلند کرنے سے عبارت ہے۔

'لاڑکانہ کے چہار درویش' کی اشاعتِ ثانی کئی مہینوں سے تکمیل کے مراحل سے گزر رہی تھی کہ کامریڈ سوبھوگیان چندانی ۸ر دسمبر ۲۰۱۴ء کو وفات پا گئے، اِس طرح واحد زندہ درویش بھی ہم میں نہیں رہا۔ کامریڈ سوبھوگیان چندانی کی رحلت کی خبر کو MEDIA خصوصیت کے ساتھ PRINTED MEDIA نے غیر معمولی اہمیت دی، اداریے

چھپے، مضامین شائع ہوئے اور بعض اخبارات نے خصوصی صفحات بھی چھاپے اور ملک کے مختلف شہروں میں اُن کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے اجتماعات منعقد کیے گئے۔ علاوہ بریں کامریڈ سید جمال الدین بخاری کی جیون ساتھی کامریڈ شانتا بخاری بھی ماضیِ قریب وفات پاگئیں۔ وہ ایک کامریڈ خاتون تھیں، لہٰذا اِس کتاب میں ضمیمے کے طور پر اُن کی حیات و خدمات کے حوالے سے چند صفحات شامل کر لیے گئے ہیں۔ اِس اشاعت میں چار اہم تحریریں شامل کی جاری ہیں جن میں سے ایک تحریر محترمہ زاہدہ حنا کی اور دوسری شاہ لطیف بھٹائی چیر کے ڈائرکٹر پروفیسر سلیم میمن کی ہے تیسری تحریر معروف دانش ور مقتدا منصور کی ہے۔ یہ تینوں تحریریں میرے نزدیک بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ اِس ضمن میں مَیں اِن تینوں کا شکرگزار ہوں۔ خالد چانڈیو صاحب کی بھی ایک تحریر شاملِ کتاب ہے جو اپنی جگہ بڑی معنویت کی حامل ہے۔ اُنھوں نے اپنی تحریر میں اردو بولنے والی آبادی سے تعلق رکھنے والی اُن ترقی پسند شخصیات کی خدمات کا مختصر تذکرہ کیا ہے جو سندھ دھرتی کو درپیش مسائل و مشکلات میں اپنے پرانے سندھیوں کے ہم دوش اور ہم سفر رہے اور جد وجہد میں حصہ لیا، خصوصیت کے ساتھ وَن یونٹ کے خلاف چلنے والی ۱۹۶۰ء کی دہائی کی تحریک میں گراں قدر خدمات انجام دیں اور اہم کردار ادا کیا جس کا اعتراف ماضیِ قریب میں شائع ہونے والی سندھی کتابوں میں نہیں کیا گیا ہے۔ میرے نزدیک یہ دانستہ یا نادانستہ صرفِ نظر سندھ کے عمومی مفاد میں نہیں ہے۔ میں اپنی تحریروں اور تقریروں میں یہ بات اردو بولنے والی آبادی کو ذہن نشیں کرانے کی سعی کرتا رہا ہوں کہ سندھ دھرتی ہماری تقدیر ہے، ہماری ماں ہے، لہٰذا ہمارا رویہ اِسی تناظر میں ہونا چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ دونوں آبادیوں کی

یک جہتی سندھ کے لیے ناگزیر ضرورت ہے، اور کسی بھی گوشے سے منفی رویہ ناقابلِ قبول ہوگا۔

'لاڑکانہ کے چہار درویش' کی پہلی اشاعت کی پذیرائی میرے لیے بڑی طمانیت اور حوصلہ افزائی کا موجب ہے، اشاعتِ ثانی کو اِسی پذیرائی کا ثمرہ تصور کیا جانا چاہیے۔

## عبدالرزاق سومرو

# پیش لفظ

لاڑکانہ کی مردم خیز مٹی سے نہایت ہی نامور شخصیات کا تعلق رہا ہے جن میں دنیائے سیاست کے شہید ذوالفقار علی بھٹو، شہید محترمہ بے نظیر بھٹو، میر مرتضیٰ بھٹو شاہنواز بھٹو، ممتاز بھٹو، محترمہ بیگم اشرف عباسی، خان بہادر ایوب کھوڑو اور قاضی فضل اللہ شامل ہیں۔ دوسری طرف علم و ادب کی دنیا سے تعلق رکھنے والے کشن چند بیوس ہوندراج دکھایل، پیر حسام الدین راشدی، پیر علی محمد راشدی، جمال ابڑو، ڈاکٹر ایاز قادری، علامہ غلام مصطفیٰ قاسمی، ڈاکٹر اللہ داد بوہیو اور دیگر کئی پیمبرانِ فکر و دانش کا تعلق بھی لاڑکانہ سے رہا ہے۔

پاکستان بننے کے بعد کئی نامور علمی و ادبی شخصیات ہندوستان کے مختلف علاقوں سے ہجرت کر کے لاڑکانہ میں سکونت پذیر ہوئیں جن میں صمد رضوی ساز، عرشی کرت پوری حکیم شاہد علی شہید، رمز شاہجہان پوری، محسن بھوپالی، شعور صدیقی، شوکت عابدی، کامریڈ

سید جمال الدین بخاری ریاض صدیقی ، بیگم سکینہ عتیق الزماں اور مسلم شمیم جیسے اہلِ قلم شامل ہیں۔

مسلم شمیم سے میری دوستی کو آدھی صدی سے زیادہ عرصہ ہونے کو ہے۔ مسلم شمیم بے چین روح اور متحرک شخصیت کے مالک ہیں۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی تخلیقی و تحقیقی سرگرمی اختیار کیے رہنا اُن کی شخصیت کا خاصہ ہے۔ کم از کم میں نے مسلم شمیم کو کبھی خاموش بیٹھے نہیں دیکھا۔

مسلم شمیم لاڑکانہ میں تھے تو کمیونسٹ پارٹی اور نیشنل عوامی پارٹی کو بھی منظم کرتے رہے، ساتھ ہی ساتھ ادب و ثقافت اور صحافت کے میدان میں بھی سرگرم رہے، نیز درس و تدریس کا دامن بھی نہیں چھوڑا۔ اُنھوں نے لاڑکانہ میں قیام کے دوران میں جہاں مقامی سندھی و اردو اہلِ قلم کے درمیان پُل کا کردار ادا کیا، وہیں اُن کی جانب سے کروائے گئے ملک گیر مشاعروں میں ملک کے نامور اردو شعرا جوشؔ ملیح آبادی فیض احمد فیضؔ، حبیب جالبؔ، قتیلؔ شفائی اجملؔ خٹک، حمایت علی شاعرؔ، حسن حمیدیؔ آفاق صدیقی اور مظہر جمیلؔ شریک ہوتے رہتے تھے۔

مسلم شمیم نے اپنے نوکِ قلم سے متعدد کتابیں بھی تحریر کی ہیں جو نظریاتی ادب میں نمایاں مقام رکھتی ہیں اور نوجوان پڑھنے والوں کے لیے حوالے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اُن کی زیرِ نظر کتاب 'لاڑکانہ کے چہار درویش' جن چار شخصیات کی زندگی اور جدو جہد کے بارے میں ہے، اُن تمام شخصیات سے میرا گہرا ذاتی تعلق رہا ہے۔

مولوی نذیر حُسین جتوئی جلالی کے میرے والدِ مرحوم دودو خان سومرو سے ذاتی مراسم تھے اور اُن کی روزانہ ملاقات ہوا کرتی تھی۔ میرے والد اور مولوی صاحب سندھ میں ہونے والے انگریزی دور کے پہلے بلدیاتی انتخابات میں رتوڈیرو میونسپل کمیٹی

کے کونسلر منتخب ہوئے تھے۔ دونوں کا تعلق کانگرس گروپ سے تھا، دونوں ہاری ورکر بھی تھے۔ مولوی صاحب کے چھوٹے بھائی امیر حُسین جتوئی اور ہم دونوں گہرے دوست اور ہم جماعت تھے۔ مولوی صاحب کی صحبت سے میں ازحد فیض یاب رہا ہوں اور اُنھی کی بدولت سوشلسٹ فکر سے روشناس ہوا۔

کامریڈ سید جمال الدین بخاری سے میری پہلی ملاقات ۱۹۴۶ء میں کراچی میں زمانۂ طالبِ علمی میں ہوئی۔ اُس دور میں سیاست سے دلچسپی کے باعث میں دوستوں کے ساتھ تھیوسوفیکل ہال، کیٹرک ہال اور خالق دینا ہال میں ہونے والے اکثر پروگراموں میں شرکت کرتا رہتا تھا، میری ہمدردیاں LEFT کے ساتھ ہوا کرتی تھیں بعد میں بخاری صاحب لاڑکانہ آئے تو میرے گھر کے قریب سکونت اختیار کی اور ہمارے آپس میں خاندانی مراسم قائم ہو گئے۔ ہماری روزانہ ملاقاتیں اور بحث و مباحثے ہوا کرتے تھے۔

کامریڈ حیدر بخش جتوئی کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ اُن سے بھی میرے ربط و ضبط کا معاملہ پاکستان بننے سے پہلے کا ہے۔ میرے والد صاحب بھی 'سندھ ہاری کمیٹی' کے کارکن تھے۔ وہ رتوڈیرو میں ہونے والی ہاری کانفرنس میں بھی شریک ہوئے تھے اور کامریڈ حیدر بخش جتوئی کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ کامریڈ حیدر بخش جتوئی کے فرزند مرتضٰی حیدر اور مصطفٰی حیدر سے میری گہری دوستی تھی۔ مصطفٰی حیدر محکمۂ اطلاعات میں دورانِ ملازمت کوئٹہ میں تعینات ہوئے تو کوئٹہ جاتے وقت میرا قیام اکثر اُنھی کے ہاں رہتا تھا مصطفٰی حیدر بھی جب لاڑکانہ آتے تھے تو میرے ہاں ہی قیام کرتے تھے۔

میں حیدرآباد جاتا تھا تو اکثر کامریڈ حیدر بخش جتوئی کے ''ہاری حق دار'' پریس میں ٹھہرتا تھا۔ اُن کا مشفقانہ رویہ مجھے آج تک یاد ہے۔ میں 'سندھ ہاری کمیٹی' کے

جلسوں میں اکثر شریک ہوتا تھا اور 'ہاری حق دار' اخبار کا سالانہ خریدار بھی تھا۔ کامریڈ حیدر بخش جتوئی نے اپنی جد و جہد اور ہاری تحریک کی بدولت ایک عرصے تک کسانوں میں نئے جذبوں اور انقلابی شعور کی آبیاری کی۔

اِس کتاب میں شامل چوتھی شخصیت کامریڈ سوبھوگیان چندانی ہیں جو بذاتِ خود ایک تاریخ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کامریڈ سوبھوگیان چندانی نے کمیونسٹ تحریک اور ترقی پسند اقدار کے فروغ کے لیے متعدد قربانیاں دی ہیں۔ وہ انتہائی پڑھے لکھے اور باشعور انسان ہیں۔ اُنھوں نے بہت پہلے ایل ایل۔ بی میں داخلہ لیا مگر قید و بند کی صعوبتوں کی وجہ سے تعلیم مکمل نہ کر سکے اور بہت بعد میں قانون کی ڈگری حاصل کی میرے ساتھ اُنھوں نے جونیر کے طور پر وکالت کی پریکٹس کا آغاز کیا، اِس وجہ سے مجھے وہ اپنا استاد گردانتے ہیں۔

میرے دوست مسلم شمیم نے درجِ بالا چاروں شخصیات پر کتاب لکھ کر جہاں اِن شخصیات کی اہمیت و مقام کو اجاگر کیا ہے، وہیں نئی نسل کو اِن شخصیات کے فکری ورثے جد و جہد، قربانیوں اور نظریاتی اساس سے واقف کرانے کا بیڑا بھی اٹھایا ہے۔ مجھے امید ہے کہ مسلم شمیم کی یہ کتاب اِن شخصیات کی زندگی اور جد و جہد کے کچھ نئے گوشے ضرور سامنے لائے گی۔

زاہدہ حنا

# ''لاڑکانہ کے چہار درویش''

برادرم مسلم شمیم سے زمینی، ذاتی، نظریاتی اور ادبی، کتنے ہی رشتے ہیں اور اِن میں سے کوئی بھی نیا نہیں۔ چند ہفتوں پہلے اُنھوں نے اپنی تازہ کتاب 'لاڑکانہ کے چہار درویش' عنایت کی تو مجھے نوعمری کے وہ دن یاد آ گئے جب ''قصہٴ چہار درویش' پڑھی تھی۔ کیا قیامت کا قصہ تھا کہ دل چھین کر لے گیا۔ قصے میں بادشاہ آزاد بخت اور اُن کی کوچہ گردی ہے جو ایک دلی آرزو کی تلاش جنگل بیابان میں کرتے ہیں۔ ایک رات فصیلِ شہر سے باہر نکل جاتے ہیں تو اندھیرے میں کچھ دور ایک شعلہ نظر آتا ہے جو آندھی میں بھی قائم ہے۔ یہ اُس طرف کو چلتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ چار گدڑی پوش فقیر نقشِ دیوار ہوئے بیٹھے ہیں، اور یوں وہ ادبی شاہکار وجود میں آتا ہے جس میں برادرنِ یوسف بھی ہیں اور جان نثار کرنے والے بھی۔ اِس کلاسیکی داستان سے شمیم بھائی کی اِس تازہ کتاب کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہاں! یہ ضرور ہے کہ لاڑکانہ کے جن

چار درویشوں کا اُنھوں نے ذکر کیا ہے، اُن کے نظریے کا چراغ مخالفت کی آندھی میں بھی روشن رہا اور اُنھوں نے اپنی زندگیاں سماج کو بدلنے پر صرف کر دیں۔ وہ انسان جن سے طبقاتی بنیادوں پر غیرانسان ہونے کا سلوک کیا جاتا تھا، اُنھیں شرفِ انسانیت سے ہم کنار کرنا اِن چار درویشوں اور کامریڈوں کا مسلک رہا۔ یہ کتاب کامریڈ سید جمال الدین بخاری، کامریڈ حیدر بخش جتوئی، کامریڈ مولوی نذیر حُسین جتوئی اور کامریڈ سوبھوگیان چندانی کی زندگیوں کا احاطہ کرتی ہے۔ اِن چار ہستیوں کے بارے میں مسلم شمیم نے قلم کیوں اٹھایا اور اِنھیں لاڑکانہ کے چہار درویش کیوں کہا، اِس بارے میں اُن کا کہنا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کا آدرش، انسانیت دوستی ہے، یہ اُن لوگوں کا حق اُنھیں دلانے کے لیے کمربستہ تھے جو غربت، بھک مری، جہل اور توہم پرستی میں مبتلا تھے۔ یوں تو ہمارے برِصغیر کی آبادی کی اکثریت اِنھی بیماریوں میں مبتلا رہی ہے لیکن اِن چار درویشوں نے اپنی توجہ سندھ کے اُن ہاریوں اور محنت کشوں کی زندگی سنوارنے پر مرکوز کر دی جن کا استحصال کبھی دین کے نام پر ہوا اور کبھی اپنی دھرتی سے اُن کی محبت اُن کے لیے سزا بن گئی۔ اِن آدرش وادیوں کے بارے میں لکھنے کا سبب بیان کرتے ہوئے مسلم شمیم لکھتے ہیں:

> ''گزشتہ چند صدیوں سے انسانی سماج ماضی کی بیش تر ظلم و جبر کی زنجیروں کو پاش پاش کرنے کا معرکہ سر کرنے میں مصروف ہے اور دھرتی پر موجود جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ تسلط کی بیخ کنی کرنے کے لیے سرگرداں ہے۔ انقلابِ فرانس ۱۷۸۹ء کے بعد سے روسو اور والٹیر کے افکار و نظریات جمہوری طرزِ احساس کی آبیاری کرتے آئے ہیں اور آزادیِ مساوات اور اخوت کا حصول آج کے انسان کا آدرش بن چکا ہے

انیسویں صدی میں جمہوری انقلابات کا تسلسل کے ساتھ آغاز اور ۱۸۴۸ء
میں مارکس اور اینگلز کے کمیونسٹ مینی فسٹو نے تاریخِ انسانی کو جو رخ دیا، وہ
انسانی خواب ہے اور اُس کی تعبیر انسان کے مستقبل کا مقدر ہے"۔

اِس کتاب 'لاڑکانہ کے چہار درویش' کا آدرش، انسان کو ہر قسم کی استحصالی زنجیروں سے نبرد آزمائی اور اُن کی شکست و ریخت کے لیے علمِ انقلاب بلند کرنے سے عبارت ہے۔ کتاب کا آغاز کامریڈ سید جمال الدین بخاری کے ذکر سے ہوتا ہے اور یہ اُن کا حق تھا۔ گجرات کے شہر احمد آباد میں ۱۴؍ مارچ ۱۹۰۰ء میں پیدا ہونے والے جمال بخاری اُن لوگوں میں سے تھے جنھوں نے بیسویں صدی میں حریتِ افکار اور انسانوں کے درمیان مساوات قائم کرنے کی لڑائی نہایت استقامت سے لڑی۔ وہ اُن چند نوجوانوں میں سے تھے جنھوں نے انقلابِ روس کے فوراً بعد کمر کس کر اِس انقلاب کا احوال اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لیے رختِ سفر باندھا اور چل نکلے۔ کامریڈ بخاری اور اُن کے ساتھیوں کے جوش و جذبہ کا اندازہ اِس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ پاپیادہ کابل اور مزار شریف سے گزرتے ہوئے سمرقند، تاشقند اور بخارا جیسے تاریخی شہروں کی فضاؤں میں سانس لیتے اور راستے کی صعوبتیں سہتے ہوئے ماسکو پہنچے جہاں اُنھوں نے ایک نئے سماج کی تعمیر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور پھر دو برس بعد ہندوستان واپس آئے تاکہ یہاں اُس انقلاب سے اُن لوگوں کو روشناس کرا سکیں جس کی یہاں کے اُن طبقات کو بے حد ضرورت تھی جن کا استحصال برطانوی حکومت اور اُس کو دوام بخشنے کی کوششوں میں مصروف ہندوستانی BEAUROCRACY اور ARISTOCRACY کر رہی تھی۔ ایک ایسے زمانے میں جب ہندوستان کی آزادی کی لڑائی مختلف سیاسی جماعتوں، گروہوں ادیبوں اور دانش وروں کی طرف سے لڑی جا رہی تھی، اُس میں

COMMUNISM کا جھنڈا اٹھا کر شامل ہو جانا ایسے ہی تھا جیسے موت کو دعوت دینا۔ ماسکو سے واپس آنے کے کچھ ہی دنوں بعد اُنھوں نے سندھ کا رخ کیا اور اپنی ساری زندگی سندھ کو سنوارنے پر صرف کر دی۔ اِس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ یہاں جم کر بیٹھ گئے ہوں بلکہ اُنھوں نے اپنے سیاسی اور سماجی افکار کے پھیلاؤ کے لیے ہندوستان بھر کا اور دنیا کے دوسرے ملکوں کا بھی سفر کیا۔ یہ بھی ایک تاریخی اعزاز ہے جو اُن کے حصے میں آیا کہ ۱۹۲۰ء میں لاڑکانہ کی آل سندھ خلافت کانفرنس میں وہ شریک ہوئے تو مولانا محمد علی جوہرؔ کی والدہ بی اماں اور مولانا شوکت علی کی رہ نمائی اُنھیں حاصل رہی ہمیں وہ ۱۹۲۵ء میں کراچی سے ایک اخبار 'آزادی' کا اجرا کرتے نظر آتے ہیں، اور پھر ۱۹۲۹ء میں اخبارِ 'چنگاری' بھی اُنھوں نے نکالا۔ مسلم شیمؔ نے ایک ایسے کامریڈ کی زندگی سے ہمیں آگاہ کیا ہے جو اپنے بیوی بچوں کے ساتھ لاڑکانہ آیا اور پھر ے ار دسمبر ۱۹۸۴ء کو آخری سانس بھی لاڑکانہ میں لی۔ مزدوروں اور ہاریوں کے حقوق کے لیے جنگ اُنھیں بار بار جیل لے گئی، لیکن یہ صعوبتیں اُن کے قدم نہ ڈگمگا سکیں۔ اُنھوں نے ایک نہایت متحرک اور بامقصد زندگی گزاری اور سندھ میں آباد ہونے کا حق ادا کر دیا۔

اِسی طرح 'ہاری تحریک' کے کامریڈ حیدر بخش جتوئی ہیں جو لاڑکانہ میں پیدا ہوئے اور جنھوں نے اعلیٰ سرکاری منصب سے استعفا دے کر 'سندھ ہاری کمیٹی' کو یوں اپنایا کہ سندھ کے جاگیردارانہ ایوانِ اقتدار میں ہلچل مچ گئی۔ مسلم شیمؔ نے بالکل درست لکھا ہے کہ

> "سندھ ہاری کمیٹی نے سندھ کے ہاریوں کے حقوق کی جدوجہد کے ساتھ اُن کو اپنے حقوق اور حیثیت کا انقلابی شعور بھی بخشا اور اُن میں زندگی کی نئی رمق پیدا کی۔ سندھ ہاری کمیٹی، جو ہاریوں کے حقوق کی تحریک

تھی ، جلد ہی ہاریوں کی سیاسی جماعت بن گئی ، کیونکہ اقتصادی حقوق کی جنگ سیاسی حقوق کی جنگ کے ساتھ جڑی ہوئی ہوتی ہے''۔

کامریڈ حیدر بخش جتوئی کی طرح مسلم شمیمؔ نے کامریڈ مولوی نذیر حُسین جتوئی کی زندگی اور اُن کی اشتراکی جد و جہد کا بھی احاطہ کیا ہے۔ یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ سید جمال الدین بخاری ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے ، حیدر بخش جتوئی کی تاریخِ پیدائش ۱۹۰۱ء اور نذیر حُسین جتوئی کی ۱۹۰۳ء ہے۔ اِس کے کچھ ہی برسوں بعد سوبھوگیان چندانی پیدا ہوئے۔ اِن لوگوں کی جنم بھومی سندھ اور اِن کی پیدائش اور ذہنی ساخت و پرداخت بیسویں صدی کا وہ زمانہ ہے جب برِصغیر ایک عظیم ابھار سے گزر رہا تھا۔ کامریڈ مولوی نذیر حُسین جتوئی انڈین نیشنل کانگرس سے وابستہ رہے ، پھر ہاری تحریک سے وابستہ ہوئے تو یہ کیسے ممکن تھا کہ اشتراکیت اِن کا اوڑھنا بچھونا نہ بن جائے۔ اِنھوں نے ہاریوں کے حقوق کی جد و جہد کے ساتھ ہی شاعری بھی کی اور بقولِ مسلم شمیمؔ اُس میں کسانوں اور مزدوروں کے حقوق کا پرچار کیا۔ انسان دوستی اور انسان پرستی سے جڑے ہوئے مولوی نذیر حُسین جتوئی کی زندگی کی تصویر کشی مسلم شمیمؔ نے بہت مہارت سے کی ہے اور اِس میں لاڑکانہ سے اپنی وابستگی اور آدرش وادی سیاست کا حصہ بن جانے کے مرحلوں کو بھی بیان کیا ہے۔ اِسی طرح لاڑکانہ کی خاک سے اٹھنے والے کامریڈ سوبھوگیان چندانی کی سیاسی جد و جہد اور اُن کے علمی و ادبی سرمایے کے بارے میں بھی بہت تفصیل سے بیان کیا ہے اور اِس سلسلے میں سید مظہر جمیل کی ضخیم کتاب 'سوبھوگیان چندانی۔شخصیت اور فن' سے مختلف حوالے بھی دیے ہیں۔

اِس کتاب کے اختتام پر یوں تو صوفی شاہ عنایت شہید اور سندھ ہاری تحریک کا تذکرہ بھی تبرک کے طور پر موجود ہے ، لیکن سچ یہ ہے کہ مسلم شمیمؔ جن کی ذہنی ، سیاسی ، علمی

اور ادبی تربیت لاڑکانہ کے اِن درویشوں کے سایے میں ہوئی، وہ بجا طور پر اِس شہر کو اپنی گیان بھومی اور پریم بھومی کہتے ہیں، اُنھوں اِس محبت اور عقیدت کا حق ادا کر دیا ہے۔ آدرش وادی سیاست کا جو چراغ اِن اکابر نے سندھ میں روشن کیا، وہ آج بھی شان سے جلتا ہے اور اُسی کی روشنی میں وہ دن ضرور آئے گا جب شاہ عنایت شہید کا نعرہ 'جو کھیڑے سو کھائے' حقیقت میں بدل جائے گا۔

پروفیسر سلیم میمن

# "لاڑکانہ کے چہار درویش"۔ ایک تاریخی دستاویز

'لاڑکانہ کے چہار درویش' مسلم شمیمؔ صاحب کی آٹھویں تصنیف ہے جو ایک برس قبل منظرِ عام پر آئی اور آج اِس کی تقریب پذیرائی ہے۔ اِس سے قبل مسلم شمیمؔ صاحب کی پانچ نثری تصانیف، جن میں تنقیدی، تحقیقی و فکری مضامین اور دو شعری مجموعے شامل ہیں، پڑھنے والوں تک پہنچ چکی ہیں۔

مسلم شمیمؔ صاحب ہر فن مولا ہیں۔ وہ صحافت کے میدان میں خدمات سرانجام دے چکے ہیں، ایک بہترین استاد و منتظم اور اعلیٰ پایے کے وکیل ہیں، اور میرے خیال میں ایک اعلیٰ پایے کے وکیل کے منصب پر فائز شخصیت کے لیے دوسرے مناصب اور تعارف ثانوی حیثیت کے رہ جاتے ہیں، کیونکہ وکالت ایسا پیشہ ہے جو کسی کو سولی پر چڑھوا دے اور اگر چاہے تو تختۂ دار سے نیچے اتروا دے، اور اُن میں یہ تمام اوصاف بدرجۂ اتم موجود ہیں۔

لاڑکانہ کی مردم خیز زمین نے مسلم شمیم صاحب کو بھی اپنے اندر یوں سمولیا کہ وہ اِسے اپنی گیان بھومی اور پریم بھومی کہنے لگے۔ ویسے بھی لاڑکانہ سندھ کا ایک تاریخ ساز ضلع ہے جس نے سیاست، ادب اور ثقافت کے میدان میں نہ صرف تاریخ ساز شخصیات کو جنم دیا بلکہ سندھ کی تاریخ کے ارتقا میں نمایاں کارنامے سرانجام دینے والی شخصیات کو پالا پوسا بھی جن کے کارناموں نے پاکستان اور سندھ کو چونکا دینے واقعات سے بھر دیا جو آج لاڑکانہ کو موئن جو دڑو کے بعد دوسرے کھنڈروں میں تبدیل کیے ہوئے ہیں اور آج سے پانچ ہزار سال بعد ہماری آنے والی نسلیں اِن دونوں کھنڈروں کا تقابلی جائزہ لے کر یہ ثابت کرنے کوشش میں سرگرداں ہوں گی کہ اِن میں سے کون سے کھنڈر قدیم ہیں اور کون سا ثقافتی ورثہ زیادہ پرانا ہے۔

مسلم شمیم صاحب نے لاڑکانہ کی تاریخ کے مختلف ادوار بھی دیکھے ہیں۔ جب لاڑکانہ اپنے عروج پر تھا تو ثقافتی، علمی، ادبی اور سیاسی تقاریب کثرت سے منعقد ہوتی تھیں اور علمی، ادبی و سیاسی شخصیات کا انتخاب کرنا مشکل ہوتا تھا کہ کس کا تذکرہ کیا جائے اور کس کو نظرانداز کیا جائے۔ اِتنے ستاروں کے جھرمٹ میں سے مسلم شمیم صاحب نے چار ستاروں کا انتخاب اس لیے کیا کہ وہ خود بھی کامریڈ ہیں، لہٰذا لاڑکانہ کے چار کامریڈوں سے اپنی سیاسی، تنظیمی و فکری ہم آہنگی کو اُنھوں نے ''لاڑکانہ کے چہار درویش' کے صفحات پر اِس طرح منتقل کر دیا ہے کہ یہ فیصلہ کرنا دشوار ہوگیا ہے کہ اِن چہار درویشوں میں سے کس کو پہلا درجہ دیا جائے اور کس کو دوسرا۔ کتاب کے فلیپ پر ذوالفقار قادری اِس حوالے سے کچھ یوں رقم طراز ہیں:

> ''مسلم شمیم نے جس فن کارانہ انداز سے اُنھیں پیش کیا ہے، اُس سے لاڑکانہ کی خوشبو، امرودوں کے درختوں کی کھنکھناہٹ، چاولوں کے

پکنے والی گرمی اور اِس دھرتی کی مٹی اور پانی کا پورا پورا حق ادا کر دیا ہے
میں نے اپنی زندگی میں اِن شخصیات سے جو کچھ حاصل کیا ہے، وہ یہ
طرزِ عمل ہے کہ ایمان کو سلامت رکھو، محنت کی عظمت کا اقرار کرو، کسی جابر
کے سامنے سر نہ جھکاؤ، مظلوم کو گلے لگاؤ اور اپنی تاریخی و تہذیبی قدروں
کو قربان نہ کرو اور اِن کی روشنی سے آنکھیں نہ چراؤ تو سر خود ہی اونچا رہے گا
اور اُن سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکو گے جن کو آج اپنی
طاقت، اپنی سیاست اور اپنی ترقی پر ناز ہے۔
کتاب میں شامل مضامین بہت دلچسپ، فکر انگیز اور سبق آموز
ہونے کی وجہ سے انتہائی اہمیت کے حامل ہیں، ایک فلسفی اور مفکر و محقق ہی
ایسا کام سرانجام دے سکتا ہے''۔

زیرِ بحث کتاب 'لاڑکانہ کے چہار درویش' کے پہلے درویش کا مرید سید جمال الدین بخاری ہیں۔ مسلم شمیم صاحب نے اُن کی ۸۴ سالہ زندگی کے رموز و اسرار کو کچھ اِس انداز میں بیان کیا ہے کہ ایک طلسمی انسان کے پیکر کا تصور ابھرتا ہے جس کی زندگی کا ہر رخ، ہر گوشہ اور ہر شعبہ یکساں تابندہ ہو کر ابھرتا ہے۔ بخاری صاحب کی زندگی ہم سب کے لیے ایک مثال ہے۔ وہ ایک عظیم انسان کے ساتھ ایک عظیم سیاست داں، مدبر، صحافی حریت پسند، تحریکِ آزادی کے عظیم سپاہی اور ایک سماجی کارکن بھی تھے۔ اُنھوں نے اپنی زندگی کا ایک طویل حصہ قید و بند کی صعوبتوں میں گزارا جن میں سے بیش تر اوقات وہ قید بامشقت سے دوچار رہے۔ اِن شدید جسمانی اذیتوں کو انتہائی ثابت قدمی سے برداشت کر کے آپ نے ثابت کر دیا کہ انسان اگر باہمت ہے تو اُس کے لیے ایسی آزمائشیں اور اذیتیں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔

کامریڈ سید جمال الدین بخاری کا پاکستان بننے کے بعد کا سفرِ حیات کئی نشیب و فراز سے دوچار رہا، مگر وہ کبھی غیر متحرک نہیں رہے۔ سکوت و جمود کے مراحل کا اُن کے سفرِ حیات میں کبھی گزر نہیں ہوا۔ مسلم شمیم صاحب نے اپنے اِس مضمون میں اپنی داخلی کیفیات کے برعکس اعداد و شمار اور تاریخوں پر زیادہ اکتفا کیا ہے اور اُن کی زندگی کے مختلف ادوار میں اُن کے فائز ہونے والے منصبوں، مختلف اداروں، انجمنوں میں اُن کی رکنیت کی تفصیلات فراہم کی ہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ اُن کی زندگی کے ایسے واقعات کا ذکر بھی کرتے جو ہمارے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوتے، خاص طور پر جب اُن کی شادی ہوئی اور شانتی اماں سے شادی ہوئی۔ میں اِس حوالے سے علی احمد بروہی صاحب کی اِس رائے کو شاملِ تحریر کرنا چاہوں گا:

''کامریڈ بخاری سرخ پارٹی کے روحِ رواں اور رہبر تھے۔ اُن کا گھر اور دفتر ایک ہی تھا جو بندر روڈ پر لائٹ ہاؤس سینما کے بغل میں تھا لیکن گھر کا تو فقط نام ہی تھا، آنے جانے والوں کے لیے بیٹھک اور اوطاق بھی تھا، کارکنوں کا تربیتی مرکز بھی تھا اور پارٹی کا دفتر بھی۔ شانتی کے آنے کے بعد اُس کو ایک منظم اور دل کش گھر کا روپ بھی مل گیا؛ سب کارکن جو پہلے منتشر اور بکھرے ہوئے تھے، اب گھر کے فرد کہلانے کے لائق بن گئے تھے؛ ملباری کے ہوٹل سے سنگل سالن کے بدلے اب گھر میں سالن اور روٹی ملنے لگی تھی؛ بخاری صاحب جو جمعے کے جمعے کپڑے بدلتے تھے، اب روز دھلے اجلے اور استری کیے ہوئے جبے پہننے لگے اور یوں پہلی بار ہوا کہ پارٹی کے آفس میں خواتین بھی آنے لگیں۔ گھروں میں کام کرنے والی ماسیوں کی علاحدہ اور محنت کش خواتین کی علاحدہ یونینیں تشکیل دی گئیں جن کی روحِ رواں بیگم بخاری شانتی اماں تھیں''۔

دوسرے درویش جن کا ذکر مسلم شمیم صاحب نے اپنی اِس تصنیف میں کیا ہے، وہ کامریڈ حیدر بخش جتوئی ہیں۔ کامریڈ حیدر بخش جتوئی کی حیثیت ایک کامل رہ نما، شاعر اور مفکر کی ہے۔ مسلم شمیم صاحب اُن کے تعارف کے ذیل میں لکھتے ہیں:

''کامریڈ حیدر بخش جتوئی کی عام شہرت ایک کمیونسٹ نظریہ رکھنے والے رہ نما کی رہی اور وہ اپنے اِن نظریات کے ساتھ عوام کے سامنے گئے ہیں اور کبھی اپنے نظریات پر پردہ ڈالنے یا معذرت خواہانہ طرزِ عمل کا مظاہرہ نہیں کیا۔ وہ یوں باضابطہ طور پر کمیونسٹ پارٹی کے رکن نہیں رہے اور نہ انجمنِ ترقی پسند مصنّفین سے اُن کی باضابطہ وابستگی رہی، مگر کمیونسٹ پارٹی اور انجمنِ ترقی پسند مصنّفین نے اُنھیں اپنا سرپرست اور اثاثہ جانا''۔

مسلم شمیم صاحب کے اِس تعارف سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کامریڈ حیدر بخش جتوئی ایسے پایے کے رہ نما، ادیب و شاعر تھے کہ اُنھیں کسی پارٹی اور پلیٹ فارم کی ضرورت ہی نہیں تھی، کیونکہ وہ پارٹی اور پلیٹ فارم کے نہیں بلکہ پارٹی اور پلیٹ فارم اُن کی سرپرستی کے محتاج تھے۔

کامریڈ حیدر بخش جتوئی کے ذکر کے ساتھ مسلم شمیم صاحب اپنی ایک تیز و تند نظم کے ذریعے اُس دور کی ایک حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اِس استعجاب کا سرچشمہ یہ حقیقت تھی کہ سندھ میں بسنے والی بیش تر اردو بولنے والی آبادی وَن یونٹ کی تائید کرتی تھی اور وَن یونٹ کے خلاف تحریک کی عملاً مخالف تھی''۔

مسلم شمیم صاحب نے درست فرمایا، کیونکہ وَن یونٹ کے بعد ۱۹۸۳ء کی ایم۔آر۔ڈی موومنٹ میں بھی اِن کا رویہ کچھ مختلف نہیں تھا، اور اب بھی یہی صورتِ حال ہے۔ اِس مضمون میں مسلم شمیم صاحب نے کامریڈ حیدر بخش جتوئی کی شاعری اور تراجم پر سیر حاصل گفتگو کی ہے، خصوصاً 'دریا شاہ' جو ایک طویل نظم ہے، کا اردو و انگریزی ترجمہ شامل کر کے مضمون کو خاصا دلچسپ اور وقیع بنا دیا ہے۔

اِس مضمون میں فاضل مصنف نے 'سندھو دریا' کے عنوان سے ''رگ وید'' سے ایک اقتباس بھی شامل کیا ہے جس کا اردو ترجمہ سید مظہر جمیل صاحب نے کیا ہے۔ یوں یہ مضمون کامریڈ حیدر بخش جتوئی کی شخصیت کے ساتھ سندھو دریا کی عظمت کا بھی حامل ہو گیا ہے۔ کامریڈ حیدر بخش جتوئی کی شخصیت اور شاعری ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں، کیونکہ اُن کی سیاسی شخصیت اور عظمت کے ساتھ اُن کی شاعرانہ شخصیت اور عظمت بھی سندھی ادب کی تاریخ کا ایک سنہری باب ہے۔ وہ ایک عظیم انسان تھے جنھیں اُن کے آدرش، جد و جہد اور قربانیوں کے باعث سندھ کی تاریخ کی ایک اہم رہ نما شخصیت گردانا جاتا ہے۔

تیسرے درویش جن کا ذکر مسلم شمیم صاحب نے کیا ہے، وہ کامریڈ مولوی نذیر حُسین جتوئی ہیں۔ وہ بھی اپنے دور کی ایک غیر معمولی شخصیت تھے، بلکہ یوں کہا جائے تو زیادہ بہتر ہو گا کہ اُن کی شخصیت کثیر الجہت تھی۔ وہ باضابطہ عالمِ دین تھے، دینی علوم کے حوالے سے اُن کا نہایت وسیع اور گہرا مطالعہ تھا۔ دین کی تفہیم میں وہ تقلید کے قائل نہ تھے بلکہ اجتہادی رویے پر عامل تھے۔ مسلم شمیم صاحب نے ایک جگہ یہ بھی تحریر کیا ہے:

> ''وہ صورتاً مولانا آزاد سے بے حد مشابہت رکھتے تھے۔ اُن کے اوطاق میں آویزاں کامریڈ مولوی نذیر حُسین جتوئی کی تصویر مولانا آزاد

سے اِس قدر مشابہت رکھتی تھی کہ آج بھی وہ تصویر میری نگاہوں میں گھوم رہی ہے''۔

میری رائے میں ویسے بھی کسی شخص کا مولوی اور دینی علوم کے ماہر ہونے کے ساتھ کمیٹڈ کامریڈ کے اوصاف اپنانا کسی سندھی ہی کا شیوہ ہوسکتا ہے۔

کامریڈ نذیر حُسین جتوئی بھی کامریڈ حیدر بخش جتوئی کی طرح ادب کی دنیا میں بھی ایک مقام رکھتے تھے۔ اُنھوں نے ''آدھی بٹائی'' تحریک میں جیل کاٹی اور جیل ہی سے شاعری کا آغاز کیا۔ فاضل مصنف نے اُن کی شاعری کے تراجم کو بھی اپنے مضمون کا حصہ بنایا ہے اور ساتھ ساتھ اُن کی بے ریا سچائی، بذلہ سنجی اور نکتہ دانیوں کے بارے میں بھی تفصیل بیان کی ہے۔

چوتھے درویش جن کا مصنف نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے، وہ تو زندہ پیر ہیں یعنی کامریڈ سوبھوگیان چندانی ہیں جو کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ وہ ادب، علم و دانش، فکر وثقافت اور مارکسی نظریے کی ایک صدی کی تاریخ ہیں۔

مصنف نے سوبھوگیان چندانی کو کمالِ فن کا ایواڑ ملنے کو ایک تاریخی واقعہ قرار دیا ہے۔ میرے خیال میں سوبھوگیان چندانی کی فکر وفلسفہ کے حوالے سے اور ادبی خدمات اگرچہ زیادہ نہیں ہیں، لیکن سندھ سے اُن کی وابستگی اور انتھک جدوجہد کے حوالے سے اُن کی خدمات کا یہ معمولی اعتراف ہے۔ اکادمیِ ادبیات کو تو روزِ اول سے اردو کے ساتھ ساتھ پاکستان کی دوسری علاقائی زبانوں کے اکابر کو بھی ایوارڈ دینے چاہیے تھے لیکن بہتر اور کم تر تو ہر جگہ پائے جاتے ہیں، خواہ وہ ادب ہو یا سیاست، فنون ہو یا زبان۔ اِس تفریق ہی نے تو آج ہمیں ایسے مقام پر لا کھڑا کیا ہے کہ ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ میں بھی سندھ کا بیٹا ہوں، مجھے اِس کے لیے کسی سرٹیفکیٹ کی ضرورت نہیں ہے۔

سوبھوگیان چندانی کی شخصیت کی بہت سی جہتیں اور پہلو ہیں اور ہر جہت اور ہر پہلو یکساں روشن اور قابلِ تحسین وتقلید ہے۔ اُن کے کارناموں کی تاریخ گزشتہ آٹھ دہائیوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ اُن کی زندگی میں سیاسی، سماجی اور ثقافتی رنگوں کے ساتھ بائیں بازو کی طرف رجحانات کی ایک طویل داستان ہے۔ اُنھوں نے عالمی شہرت یافتہ درس گاہ شانتی نیتکن میں رسمی تعلیم حاصل کی اور بنگالی کے معروف شاعر، ڈراما نگار اور مفکر رابندر ناتھ ٹیگور کی نہ صرف قربت حاصل کی بلکہ اُن سے قریبی مراسم کی وجہ سے اُن کے ذاتی کتب خانے سے بھرپور استفادہ بھی کیا۔ یہی وہ درس گاہ تھی جہاں تحریکِ آزادی کے مختلف رہ نماؤں سے آپ کے روابط قائم ہوئے، اِسی مادرِ علمی میں مختلف انقلابی رہ نماؤں سے بھی آپ کے روابط قائم ہوئے اور یہیں مختلف معاشی سیاسی اور سماجی نظریات بالخصوص مارکسی فلسفے اور فکر سے آگاہی بھی حاصل ہوئی اور انسانی تہذیب کے جدلیاتی عمل کو بیسویں صدی کے عالمی تناظر میں سمجھنے کے مواقع بھی حاصل ہوئے۔ دراصل شانتی نیتکن کے عرصۂ قیام اور حصولِ علم کے ثمرات نے سوبھوگیان چندانی کی تعمیر وتشکیل اور اُن کے فکر وشعور کے ارتقائی سفر میں اہم کردار ادا کیا۔

چونکہ اِن چاروں درویشوں کا محنت کش طبقے خصوصاً کسانوں سے قریبی اور گہرا تعلق رہا، اس لیے مسلم شمیم صاحب نے شاہ عنایت شہید کے انقلابی نعرے 'جو کھیڑے سو کھائے' کے حوالے سے، جو خود کسانوں اور فقیروں کو صدیوں پرانے استحصالی اور جاگیردارانہ نظام سے چھٹکارا دلانے کے لیے کوشاں تھے، اُن کی عملی جدوجہد اور فکر و عمل پر بھی ایک مختصر اور جامع مضمون شاملِ کتاب کیا ہے۔ اُس وقت نہ انقلابِ روس آیا تھا نہ چین میں کمیونزم، ورنہ شاہ عنایت شہید بھی کامریڈ شاہ عنایت کہلواتے۔ اِس

کتاب کے آخر میں 'سندھ میں ہاری تحریک کا تاریخی پس منظر اور مختصر جائزہ' کے عنوان سے ایک تحقیقی مضمون بھی مصنف نے شامل کیا ہے جس کی تاریخ اُنھوں نے مسلمانوں کی سندھ میں آمد یعنی ۷۱۲ء سے شروع کی ہے اور اُسے موجودہ دور تک لائے ہیں۔ یہ مضمون بھی سندھ کی تاریخ کی ایک اہم دستاویز ہے جس میں ہاریوں اور کاشت کاروں کے مسائل کو جس تجزیاتی انداز میں پیش کیا گیا ہے، اُس سے پورے برِصغیر میں اِن پس ماندہ طبقوں کے حالات کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔

مجموعی طور پر 'لاڑکانہ کے چہار درویش' سندھ کے ساتھ برِصغیر کی بیسویں صدی کی تاریخ کی بھی ایک اہم دستاویز ہے جو تاریخ پر تحقیق کرنے والوں کے لیے ایک بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔

مقتدا منصور

# "لاڑکانہ کے چہار درویش"

ایک مشہور سندھی کہاوت ہے کہ "جیب میں ہو اگر نامہ تو جاؤ گھومنے لاڑکانہ" کیونکہ لاڑکانہ بھی اہلِ سندھ کے خوابوں کا محور ہوا کرتا تھا۔ یہ وہ شہرِ نگاراں ہے جس کے پہلو سے سندھو ندی مست و خراماں گزرتی ہے، جس کے دامن میں دنیا کی ایک عظیم تہذیب و تمدن کی نشانیاں موجود ہیں، جس کی فضاؤں میں "ساری مستی شراب کی سی ہے" والی کیفیت پائی جاتی ہے، جس کی سوندھی مٹی میں ماں کی چھاتیوں جیسی مہک ہے۔ یہی وہ شہر ہے جس کی کوکھ سے انگنت نادرِ روزگار ہستیوں نے جنم لیا جن کا شمار ممکن نہیں، مگر پھر بھی ماضیِ قریب پر نظر ڈالیں تو سیاست کے میدان میں ہمیں جہاں سر شاہنواز بھٹو، خان بہادر ایوب کھوڑو، قاضی فضل اللہ، ذوالفقار علی بھٹو اور بے نظیر بھٹو جیسی نامور اور عالمی شہرت کی حامل شخصیات نظر آتی ہیں، وہیں علم و ادب کی دنیا میں ایک سے بڑھ کر ایک نگینہ اِس شہر کی مٹی سے ابھرتا نظر آئے گا۔ پیر علی محمد راشدی

پیر حسام الدین راشدی، کشن چند بیوس، ہوندراج دکھایل، جمال ابڑو، ڈاکٹر ایاز قادری اور پروفیسر غلام مصطفیٰ قاسمی جیسی ہستیوں نے اِس شہر کے نام کو چار چاند لگائے، جبکہ آج جامی چانڈیو جیسا ماہرِ عمرانیات اِس کے ماتھے کا جھومر ہے۔ اِن کے علاوہ انگنت نوجوان قلم کار اور فن کار اِس کے نام کو زندہ و تابندہ رکھنے کے لیے اپنا حصہ ڈالنے کی کاوشوں میں مصروف ہیں۔

جس طرح محبتوں کا محور سکھر ہے، اِسی طرح لاڑکانہ مسلم شمیم کی گیان بھومی اور پریم بھومی ہے۔ اِس شہر سے اُن کی عقیدتیں اُن کی ہر تحریر اور ہر تقریر میں نمایاں رہتی ہیں۔ جس طرح سکھر اور شکارپور کا ہر محلّہ اور ہر گھٹی (گلی) کبھی میرے قدموں کی دھول ہوا کرتی تھی، اِسی طرح لاڑکانہ کا ہر چوک اور چوبارہ مسلم شمیم کی یادوں کے انمٹ نقوش اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ اگر دل کی بات کہوں تو چالیس برس سے کراچی میں رہنے کے باوجود آج بھی میرے دل و دماغ کے گوشے سکھر کی یادوں سے منور ہیں یقیناً یہی حال مسلم شمیم کا بھی ہوگا، میری طرح اُن کی روح بھی اترادی سندھ کے شہروں میں بھٹکتی رہی ہوگی۔ میں نے اب تک جو بھی خواب دیکھا ہے، اُس میں سکھر ہی نظر آیا ہے، شاید یہی کیفیت مسلم شمیم کی بھی ہو۔

مسلم شمیم ایک صاحبِ طرز شاعر، ایک بلند پایہ دانش ور اور ایک انتہائی COMMITTED نظریاتی انسان ہیں۔ اُنھوں نے خالص نظریاتی موضوعات پر کئی کتب تحریر کی ہیں جن میں 'نظریات کا تصادم' چونکا دینے والی کتاب ہے۔ اُن کی شاعری بھی اُن کے فکری رجحانات کی عکاس ہے۔ وہ انجمنِ ترقی پسند مصنّفین کے مرکزی صدر نشیں بھی ہیں اور حتی المقدور اُسے ایک نئی جہت دینے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ مگر

جہاں تک یادوں کے دریچوں کا معاملہ ہے تو اُن میں جھانکتے ہوئے اُنھیں ''من تو شدم، تو من شدی'' کے مصداق چہار سُو لاڑکانہ ہی نظر آتا ہے جو اُن کی محبتوں اور چاہتوں کا مرکز ہے جہاں گزرے شب و روز سنگی، ساتھیوں سے ہونے والی گپ شپ اور اہلِ علم و دانش کی حکمت افروز گفتگو اور انسان کی عظمت کے لیے لڑی جانے والی لڑائی کے مناظر اُن کے ذہن کو معطر رکھتے ہیں۔ مسلم شمیم، جو محنت کی عظمت اور فکری تنوع کے سچے داعی ہیں، اپنے اُن محسنوں کو کیونکر فراموش کر سکتے ہیں جن کے آگے زانوئے ادب تہ کر کے اُنھوں نے اِن آفاقی سچائیوں کا ادراک حاصل کیا۔ یہ ہستیاں صرف مسلم شمیم ہی کی فکری اتالیق نہیں ہیں بلکہ اُن تمام لوگوں کے لیے رہبری و رہ نمائی کا ذریعہ ہیں جو فکری کثرتیت اور انسان کی عظمت پر یقین رکھتے ہیں۔ اِسی جذبے اور سوچ کے نتیجے میں یہ کتاب 'لاڑکانہ کے چہار درویش' وجود میں آئی ہے۔

یہ سب باتیں اس لیے وثوق کے ساتھ لکھ رہا ہوں کہ اپنی کتاب 'لاڑکانہ کے چہار درویش' میں اُنھوں نے جس چاہت اور چاؤ سے اُن درویشوں کا تذکرہ کیا ہے جن کا آدرش انسانیت دوستی کے نقطۂ عروج سے شروع ہو کر سماج کی طبقاتی جدوجہد پر منتج ہوتا ہے، وہ اُن کی اِس شہر سے وابستگی کا بین ثبوت ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں جن شخصیات کی زندگی پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے، وہ ہر اُس شخص کے لیے اہمیت کی حامل ہیں جو سماج میں جاری ناانصافیوں، ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں کو ناپسند کرتے ہوئے اِن سے چھٹکارا پانے کی کوشش کرتا ہے۔ ہر وہ شخص جو اِن ہستیوں کی تمام زندگی حق گوئی اور جراُتِ رندانہ پر قائم رہنے کی روایات کو سمجھتا ہے، اِن کا نام آتے ہی اُس کا سر احترام میں جھک جاتا ہے۔ یہ چار ہستیاں کامریڈ سید جمال الدین بخاری، کامریڈ حیدر بخش جتوئی کامریڈ مولوی نذیر حُسین جتوئی اور کامریڈ سوبھو گیان چندانی کی ہیں۔ اِن میں اول الذکر

درویش یعنی کامریڈ سید جمال الدین بخاری ہندوستان سے ہجرت کر کے آئے اور پھر لاڑکانہ کی زلف کے ایسے اسیر ہوئے کہ اُنھوں نے اِس شہر کو نہ صرف اپنی سیاسی جدوجہد کا مرکز و محور بنایا بلکہ اپنی تمام زندگی اِسی شہر کی محبتوں کی نذر کر دی۔ بقیہ تین درویشوں نے اِسی شہر میں جنم لیا۔

کتاب کے 'حرفِ آغاز' میں مصنف مسلم شمیم کہتے ہیں:

''اِس کتاب میں جن چار شخصیتوں کی جدوجہد سے عبارت حیات کی روداد اجمالاً بیان کی گئی ہے، یہ چاروں ہستیاں، جامعیت اور کثیرالجہتی کی حامل آدرش وادی شخصیات ہیں۔ یہ شخصیات سماج کی اُن بنیادوں کی بیخ کنی کرنا چاہتی تھیں جو اِس دھرتی پر جبر و استحصال کا سرچشمہ تھیں''۔

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:

''۱۷۸۹ء میں انقلابِ فرانس کے بعد روسو اور والٹیر کے افکار و نظریات جمہوری طرزِ احساس کی آبیاری کرتے نظر آتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ آزادی، مساوات اور اخوت آج انسان کے MIND-SET بن چکے ہیں۔ ۱۹ویں صدی میں جمہوری انقلابات کے تسلسل کے ساتھ آغاز اور ۱۸۴۸ء میں مارکس اور اینگلز کے کمیونسٹ منشور نے تاریخ کے دھارے کو نہ صرف از سرِ نو CHANNELIZE کیا بلکہ دھرتی پر محنت کشوں کی حکومت کے قیام کی نظریاتی سمتیں بھی طے کر دیں اور انقلاب کے خد و خال کی نشاں دہی بھی کر دی''۔

سابق اکاؤنٹنٹ جنرل سندھ ذوالفقار قادری کا اِس کتاب کے حوالے سے کہنا ہے:

''قحط زدہ معاشرے میں جہاں ہر طرف بے چینی و اضطراب کا دور دورہ ہے، بڑی مشکل سے انسانوں کو تلاش کیا جا سکتا ہے۔ یہ سماج ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو سکتا ہے، صرف اس لیے کہ اچھے انسان خاموش ہو گئے ہیں یا گوشہ نشینی اختیار کیے ہوئے ہیں، لیکن کچھ لوگ ببانگِ دہل اچھائی کا پرچار کرتے ہوئے نظر آئیں گے، وہ تھوڑے ہی سہی لیکن اصل انسان کی قبا اوڑھے ہوئے ہیں۔ کسی کے بقول اگر دو قیدی سلاخوں کے پیچھے سے جھانکتے ہیں تو ایک کو کچرا نظر آئے گا تو دوسرے کو ستارے۔ مسلم شمیؔم ہمیشہ لاڑکانہ کے ستاروں ہی کے کھوج میں رہے ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ لاڑکانہ کی مردم خیز سرزمین سے چار ہیروں یا ستاروں کو یک جا کر کے ایک کتاب کی شکل میں لے آئے ہیں۔ یہ چہار درویش واقعی عظیم لوگ ہیں جنھوں نے جو شمعیں جلائیں وہ کبھی ماند نہیں پڑیں گی۔ مسلم شمیؔم نے جس فن کارانہ انداز سے اُنھیں پیش کیا ہے، اُس سے لاڑکانہ کی خوشبو امرودوں کے درختوں کی کھنکھناہٹ، چاولوں کے پکنے والی گرمی اور اِس دھرتی کی مٹی اور پانی کا پورا پورا حق ادا کر دیا ہے''۔

مسلم شمیم نے ''لاڑکانہ کے چہار درویش'' لکھ کر دراصل ۲۰ ویں صدی میں نہ صرف اترادی بلکہ پورے سندھ میں ہونے والی سیاسی و طبقاتی جدوجہد کی سیاسی تاریخ کو ایک کتاب میں جمع کر دیا ہے۔ ہم جیسے لوگ جو اِن نابغۂ روزگار ہستیوں سے ملنے کا اعزاز رکھتے ہیں، مسلم شمیؔم کی اِس کاوش کی شاید وہ پذیرائی نہ کر سکیں جس کے وہ حق دار

ہیں اور شاید اُنھیں مبارک باد دے کر مطمئن ہو رہے ہیں، لیکن تصور کیجیے کہ آنے والے زمانوں میں جب کوئی محقق سندھ کی تاریخ پر تحقیق کر رہا ہو گا تو یہ کتاب اُسے کس قدر فیض پہنچائے گی، اُسے ہمارے اِس زمانے میں سماجی انصاف، سیاسی و جمہوری آزادیوں اور حقوقِ انسانی کے لیے کی جانے والی جد و جہد کا صحیح اور حقیقت پسندانہ ادراک ہو سکے گا اور وہ تاریخ کے ابواب کو درست شکل میں پیش کرنے کے قابل ہو سکے گا۔ اس لیے میری ذاتی رائے یہ ہے کہ تاریخ، ادب اور سیاسیات میں دلچسپی رکھنے والے احباب کے علاوہ تاریخ اور سیاسیات کے طلبا و طالبات بھی اِس کتاب کا مطالعہ ضرور کریں، کیونکہ یہ کتاب اُنھیں تاریخ کے اُن گم نام ابواب تک رسائی دے گی جنھیں بوجوہ ہماری ریاست عوام تک پہنچنے نہیں دینا چاہتی جس کی وجہ سے نوجوان نسل کے ذہنوں پر تاریخ اور سماجیات کے حوالے سے جالے لگ چکے ہیں۔ یہ کتاب اُن جالوں کو صاف کرنے اور ذہن میں کشادگی اور فکری بالیدگی پیدا کرنے کا سبب بنے گی۔ یہ کتاب سوچ کے دھاروں کو حقیقت پسندانہ شکل دینے میں معاون و مددگار ثابت ہو گی۔

**خالد چانڈیو**

# درویشوں کی کہانی۔ درویش کی زبانی

میں بچپن میں گل بکاؤلی، داستانِ امیرِ حمزہ، سند باد کے سفر، الف لیلہ اور کئی دیگر داستانوں کے ساتھ چہار درویشوں کا قصہ بھی بڑے مزے لے کر پڑھا کرتا تھا اور ایک عجیب قسم کی افسانوی دنیا میں کھو جاتا تھا۔ اِن قصوں اور داستانوں میں جِنوں، پریوں شہزادیوں اور دیگر مافوق الفطرت کرداروں کی باتیں اور کارنامے ہوتے تھے، ایک کے بعد ایک محیرالعقول واقعے کے تانتے بندھے ہوتے تھے۔ عمر کے ساتھ شعور کی سطح بلند ہوئی تو مجھے جدید و کلاسیکی شاعری، افسانوی اور دیگر نوعیت کی کتابیں پڑھنے کا موقع ملنے لگا، ساتھ ہی اپنے والد کے دوستوں کامریڈ حیدر بخش جتوئی، شیخ ایاز نیاز ہمایونی، قاضی فیض محمد، تنویر عباسی، عبدالواحد آریس، کامریڈ سید جمال الدین بخاری میر رسول بخش تالپور، میر علی احمد تالپور، کامریڈ امام علی نازشؔ اور دیگر کئی ادبا و شعرا کے ساتھ میل جول کی وجہ سے میں ادبی و سیاسی تقریبات میں بھی شریک ہونے لگا۔

# لاڑکانہ کے چہار درویش

بہت عرصے بعد اپنے محترم دوست مسلم شمیم کی کتاب 'لاڑکانہ کے چہار درویش' ہاتھوں میں آئی تو بچپن میں پڑھے ہوئے قصے یاد آنے لگے۔ کتاب کی اشاعتِ ثانی پر میں اُن کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ یہ اشاعتِ ثانی اِس بات کا ثبوت ہے کہ مسلم شمیم کے چہار درویش بھی بچپن میں پڑھے ہوئے درویشوں کی طرح مقبول ہیں۔ اِن چہار درویشوں اور دیومالائی چہار درویشوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ مسلم شمیم کے چہار درویش کسی بادشاہ کے مصاحب یا خوشامدی نہیں اور اُن کے پاس کوئی مافوق الفطرت قوت نہیں، بلکہ یہ چہار درویش عوامی نظریے کی بنا پر عوام کو جگاتے ہوئے جاگیرداری سامراجیت اور آمریت کے خلاف جدوجہد کرنے والے کردار ہیں۔ یہ چہار درویش سرزمینِ سندھ کے طول و عرض میں گندم، کپاس اور دھان کے کھیتوں میں کام کرنے والے کسانوں اور دھواں اگلتی چمنیوں والے کارخانوں میں محنت کرنے والے مزدوروں کے حقوق کا پرچم بلند کرنے کے ساتھ سندھ کے قومی حقوق کی جدوجہد میں بھی پیش پیش رہتے تھے۔

کامریڈ سید جمال الدین بخاری، کامریڈ حیدر بخش جتوئی، کامریڈ مولوی نذیر حُسین جتوئی اور کامریڈ سوبھوگیان چندانی جیسے درویش مسلم شمیم کی اِس کتاب کا عنوان ہیں جنھوں نے اپنی تمام زندگی جاگیرداری، انگریز سامراج اور ایوب آمریت کے ساتھ ساتھ وَن یونٹ کے خلاف جدوجہد میں صَرف کی۔ کسانوں پر جبر کرنا، مذہب کو آلۂ کار بناکر عوام پر ناروا پابندیاں عائد کرنا اور اقلیت کا اکثریت کو غلام بنانا جاگیرداری کا شیوہ ہے، یعنی جاگیرداری تہ در تہ آمریت کا نام ہے۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں ۱۲ر جولائی ۱۹۳۰ء کو جی۔ ایم۔ سید، شیخ عبدالمجید سندھی، جیٹھ مل پرسرام، جمشید مہتا، کامریڈ عبدالقادر کھوکھر قادر بخش نظامانی اور دیگر حضرات نے مل کر میرپور خاص میں 'سندھ ہاری ایسوسی ایشن' کی

بنیاد رکھی تھی جو ۱۹۴۰ء کی دہائی میں 'سندھ ہاری کمیٹی' کے نام سے تناور درخت بن چکی تھی اور مسلم شمیم کے بیان کردہ چہار درویشوں کی کرامت سے پھل پھول رہی تھی۔

پاکستان بننے کے بعد بہت بڑی تعداد میں اردو بولنے والے ہندوستان کے مختلف علاقوں سے آکر سندھ میں آباد ہوئے جن میں بہت سے ترقی پسند شاعر و ادیب اور مارکسی نظریے سے وابستہ افراد شامل تھے جنھوں نے یہاں آکر سندھ دھرتی کے مزدوروں اور کسانوں کے شانہ بشانہ جدوجہد کی جن کا شمار انھی درویشوں میں کیا جانا چاہیے اُن درویشوں میں کامریڈ عزیز سلام بخاری، کامریڈ اعزاز نذیر، کامریڈ امام علی نازش سید علی مطاہر جعفری، سید رشید احمد ایڈوکیٹ، عزیز اللہ سائیں، سید کاوش رضوی، حسن حمیدی محمد یامین، شمیم واسطی، سید علی امجد ایڈوکیٹ، سید نبی احمد، سید مظہر جمیل اور شعور صدیقی شامل ہیں۔ مسلم شمیم کا شمار بھی میرے نزدیک انھی عوام دوست درویشوں میں کیا جانا چاہیے یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہمیشہ سندھ کے مستقل باشندوں، یعنی سندھی اور اردو بولنے والوں کے درمیان پُل کا کردار ادا کیا اور نفرتوں کو گھٹانے اور محبتوں کو بڑھانے کی کوشش کی۔ وَن یونٹ کا قیام ہو یا سندھی زبان کا مسئلہ، سندھ کی وحدت کی بات ہو یا کالا باغ ڈیم کی سازش اِن سب نے اپنے اپنے حصے کا کام کیا۔ یہ تمام شخصیات جی۔ ایم۔ سید کے ساتھ مل کر اینٹی وَن یونٹ فرنٹ اور کئی دیگر تحریکوں میں بھرپور شرکت کرنے کے ساتھ عملی جدوجہد کے تحت بھوک ہڑتالوں، جلسے جلوسوں اور کانفرنسوں میں بھی اُن کے ساتھ رہیں اور اِن سب نے قید و بند کی صعوبتیں بھی اٹھائیں۔

مسلم شمیم اپنے قلم کے ذریعے دوسروں کو متحرک اور فعال رکھتے ہیں۔ اُن کی نظم 'جیے سندھ' قوم پرست حلقوں میں نہایت مقبول ہوئی جو اُنھوں نے ۱۷ر جنوری ۲۰۱۰ء میں جی۔ ایم۔ سید کی سالگرہ کے موقع پر 'سن' میں پیش کی تھی۔ مسلم شمیم نے ہمیشہ اپنے

قلم کے ذریعے محکوم و مظلوم سندھی عوام کے مسائل کے ساتھ سامراجیت اور طبقاتی نظام کے تضادات کو بے نقاب کیا ہے۔ نظریاتی طور پر سوشلسٹ بلاک کے تحلیل ہو جانے کے باوجود مسلم شمیم طبقاتی جدوجہد کے مورچے میں اپنے دوستوں کے حلقے کے ساتھ ڈٹے ہوئے ہیں اور مختلف ممالک میں انقلابوں اور انقلابیوں کا دم گھٹنے کے باوجود مارکسزم کی آکسیجن میں نہ صرف خود سانس لے رہے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی نظریاتی آکسیجن فراہم کر رہے ہیں۔ وہ صرف شاعر ہی نہیں بلکہ انقلابی و سماجی کارکن، منتظم، مضمون نگار سوانح نگار، منفرد نقاد، ادبی نظریہ داں اور ماہر قانون داں بھی ہیں۔ اُن کے نظریاتی کمٹمنٹ اور وابستگی، تخلیقی کارناموں اور نصف صدی پر محیط اُن کی ادبی زندگی کے اعتراف میں اُن کو متفقہ طور پر انجمنِ ترقی پسند مصنّفین پاکستان کے مرکزی صدر کے منصبِ عظیم کے لیے منتخب کیے گئے، اور ۲۳؍ مارچ ۱۹۱۳ء سے نومبر ۲۰۱۵ء تک وہ اِس منصب پر فائز رہے۔ اُن کے عرصۂ حیات کے دوران میں ترقی پسند تحریک کی فعالیت غیر معمولی طور پر فزوں تر ہوئی۔ اِس تناظر میں ادبی دنیا میں عمومی اور ترقی پسند حلقوں میں خصوصی طور پر اُن کی عزت و توقیر میں اضافہ ہوا، اور اُن کی خدمات کا اعتراف کیے جانے کا سلسلہ جاری ہے:

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

# لاڑکانہ کے چہار درویش

# کامریڈ سید جمال الدین بخاری

۱۹۰۰ء-۱۹۸۴ء

کامریڈ سید جمال الدین بخاری بیسویں صدی کے عین اختتامی سال ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے اور بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں اِس جہانِ فانی سے عدم آباد میں مکین ہوئے۔ آغازِ سفرِ حیات سے اُنھوں نے ایک غیرمعمولی شخصیت کی زندگی گزاری۔ وہ جیتے جی ایک LEGEND بن گئے تھے۔ اُن کی زندگی جد و جہد سے عبارت تھی۔ معرکۂ خیر و شر میں وہ ایک مثالی کردار نظر آئے۔ وہ مجھے محبت کا پیکر، خلوص کا مجسمہ اور ایک عظیم آدرش وادی اور شرفِ بشر کے زبردست پرچارک نظر آئے۔ وہ اپنی ذات میں سیماب صفت تھے۔

کامریڈ سید جمال الدین بخاری کے حوالے سے یہ بات رسمی نہیں بلکہ امرِ واقعہ ہے کہ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن، ایک ادارہ اور ایک تحریک تھے۔ اِس کے ساتھ یہ کہنا بھی اظہارِ حقیقت کے مترادف ہے کہ وہ جامع الصفات اور کثیرالجہت شخصیت

کے مالک تھے۔ اُن کی شخصیت کی کثیرالجہتی میں جامعیت اور گیرائیت کی کارفرمائی ہر جہت اور زاویے سے عیاں تھی۔ اُن کی شخصیت کا ہر پہلو یکساں روشن وتاب ناک تھا وہ ایک عظیم مجاہدِ آزادی، انقلابی رہ نما، سیاست داں اور سیاست کار ہونے کے ساتھ ایک عظیم دانش ور، شعلہ بیاں مقرر (ORATOR) اور صاحب الرائے قلم کار بھی تھے۔ اُن کی جدوجہد اور سیاست عام ڈگر کی سیاست اور جدوجہد نہ تھی بلکہ اُس کا تعلق صدیوں سے جاری وساری معرکۂ خیر وشر سے تھا۔ وہ شر کی طاقتوں کے خلاف خیر کا پرچم بلند کیے رہے اور اِس کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ وہ جبر واستحصال سے پاک معاشرے کے قیام وتعمیر کے داعی تھے۔ وہ معاشرے میں سطحی اصلاح کے خواہاں نہیں بلکہ انقلابی تبدیلیوں کے مدعی تھے۔ وہ انسان کو ہزاروں سال پرانے ظلم وعدمِ مساوات کی زنجیروں سے نجات دلانا چاہتے تھے۔ وہ ایک ایسے نظامِ معاشرت کے لیے سرگرمِ عمل رہے جس میں انسان کے ہاتھوں انسان کا استحصال نہ ہو۔ وہ اِس معاشرے کو جنتِ ارضی کی صورت میں دیکھنے کے آرزومند تھے جہاں غربت وافلاس، ناداری، بے روزگاری اور سماجی ناانصافیوں کا کوئی عمل دخل نہ ہو۔ اُنھوں نے اپنی زندگی کا ہر لمحہ اپنے اِس آدرش کو عملی شکل دینے کی جدوجہد میں بسر کیا۔ اِس راہ میں وہ انتہائی صبر آزما مرحلوں سے دوچار ہوئے اور اُنھوں نے غیرمعمولی جسمانی اذیتوں اور قید وبند کی صعوبتوں کو جھیلا مگر کسی مرحلے پر اپنے کمٹمنٹ سے روگردانی نہیں کی۔ اُنھوں نے کبھی حوصلہ نہیں ہارا اور باطل کی قوت کے سامنے وہ کبھی نہیں جھکے۔ وہ ساری عمر برطانوی سامراج سے نبردآزما رہے اور آزادی کے بعد سامراج کی جانشیں استحصالی طاقتوں سے برسرِ پیکار رہے۔ وہ ایک صاحبِ بصیرت وصاحبِ بصارت دانش ور اور نظریہ داں تھے۔ اُنھیں ایک نابغۂ روزگار (GENIUS) کہنا کسی طور پر مبالغہ آمیز بات نہ ہوگی۔ اُن کی ہمہ دانی اور باخبری کا سکہ

سکۂ رائج الوقت کی طرح تسلیم کیا جاتا تھا۔ اِن ساری صفات اور خصوصیات نے مل کر اُن کی غیر معمولی شخصیت کی تعمیر و تشکیل کی تھی۔ کسی شخص کا شخصیت کا روپ دھار لینا بذاتِ خود ایک غیر معمولی بات ہے بلکہ عظمت کی دلیلِ روشن ہے۔ سید جمال الدین بخاری میرے نزدیک ایک شخص کا نام نہیں بلکہ ایک شخصیت کا نام ہے۔ وہ سحر آفریں شخصیت (CHARISMATIC PRSONALITY) کے مالک تھے۔ یہ منصب اُنھیں اپنی زندگی کے اوائلِ سفر ہی میں حاصل ہو گیا تھا اور وقت کے گزرنے کے ساتھ اُن کی شخصیت کے خد و خال روشن سے روشن تر ہوتے گئے۔ وہ منصبِ آدمیت سے بلند تر منصب، یعنی منصبِ انسانیت پر فائز تھے۔ مرحوم سید جمال الدین بخاری اُن شخصیتوں میں سے تھے جن کی یاد اور تصور نا قابلِ فراموش ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہر شخص کی زندگی میں کچھ ایسی شخصیتوں کی یادیں ہوتی ہیں جنھیں لازوال کہنا چاہیے اور جن کی قربت و صحبت کے اثرات ہمیشہ قائم رہتے ہیں اور جن سے مراسم و تعلقات فخر و ناز کا احساس جگاتے ہیں سید جمال الدین بخاری میرے لیے اُنھیں اکابر میں سے ایک تھے جن کی یاد متاعِ فخر اور جن کا تصور مینارۂ نور کا درجہ رکھتا ہے۔ مرحوم بخاری کے تصور کے ساتھ میرا غرورِ آدمیت فزوں تر اور فخرِ انسانیت سوا ہو جاتا ہے۔ وہ معاشرے کے لیے ایک قیمتی اثاثہ (ASSET) تھے۔ وہ بیسویں صدی کے بائیں بازو کے دانش وروں اور سیاست کاروں کے اُس قبیلے سے تعلق رکھتے تھے جنھوں نے اپنا سب کچھ معاشرے کے لیے تج دیا۔ بخاری صاحب نے اپنے موروثی اثاثوں سے خود کو شعوری طور پر محروم کیا اور HAVE کے طبقے سے نکل کر HAVE NOTS کے طبقے میں شامل ہو گئے۔ اُنھوں نے بڑی دیانت اور سچائی کے ساتھ خود کو مظلوموں اور استحصال کے شکار عوام کے ساتھ اپنی عملی یک جہتی کی راہ اپنائی۔ وہ اِس باب میں مہاتما گوتم بدھ کی سنت کے پیروکاروں میں شمار کیے جا سکتے ہیں جس

فہرست میں سید سجاد ظہیر کا نام بھی بہت نمایاں ہے جن کا ذکر بخاری صاحب بڑی محبت اور احترام سے کیا کرتے تھے۔

وہ ایک عظیم انسان تھے اور میرے نزدیک لفظِ عظیم کے تمام تقاضوں اور معیارات پر پورے اترتے تھے۔ اُس عظیم انسان کے تصور کے ساتھ اُس کے لیے عقیدت ومحبت کے جذبات واحساسات کا بیدار نہ ہونا ممکن نہیں۔ میرے اِس بیان کی تائید وہ ہزاروں بلکہ لاکھوں لوگ کریں گے جنھیں مرحوم کا مریڈ بخاری کی محبت و قربت حاصل رہی ہو، خواہ یہ قربت ومحبت کتنی مختصر ہی کیوں نہ ہو۔ مرحوم کو جاننے والے اوراُن سے عقیدت ومحبت رکھنے والے بلامبالغہ آج بھی ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں برِصغیر کے گوشے گوشے میں موجود ہیں، خاص طور پر سندھ کے قریے قریے میں سید جمال الدین بخاری کا ذکرِ خیر آج بھی احترام سے ہوتا ہے اور وہ محبت اور بھائی چارگی کے پیکر و علامت کے طور پر اُن کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے لاڑکانہ کی گلیاں اور سڑکیں اِس درویش صفت انسان کے نقوشِ پا سے آج بھی منور ہیں:

هرگز نه میرد آں که دلش زنده شد به عشق
ثبت است بر جریدهٔ عالم دوامِ ما
(حافظ شیرازی)

عوام میں رہنا، عوام کے دُکھ سُکھ کو اپنا جاننا اور عوام کو مصائب و آلام اور جبر و استحصال سے نجات دلانے کی جد و جہد میں ہمہ تن مصروف رہنا اور ساری عمر اِس مشن کے لیے آزمایشوں سے سرفراز گزرتے رہنا گویا اِس عظیم انسان کا مقصدِ حیات تھا۔ اِس عظیم انسان کی طویل اور عہد آفریں زندگی پر مختصر ترین مگر جامع تبصرہ ضرور کیا جا

سکتا ہے۔عوام دوستی اُن کی فکر کا سرچشمہ، اُن کے نظریات کی بنیاد، اُن کی سیاست کی اساس، سماجی سرگرمیوں کا محور اور جدوجہد سے بھرپور اُن کی زندگی کا آدرش تھی۔ اُن کی انسان دوستی تمام سابقوں اور لاحقوں سے بے نیاز تھی۔ اُن کے نزدیک انسان صرف انسان تھا، خواہ اُس کا تعلق کسی خطے، کسی نسل یا نسلِ انسانی کے کسی گروہ سے ہو، اُس کا رنگ و نسل اور اُس کے عقائد کچھ بھی ہوں، یہ سب باتیں اُن کے نزدیک فروعی بلکہ بے معنی تھیں۔ اُن کے ذہنی سفر کے کسی موڑ اور مرحلے پر تعصبات و تنگ نظری اور کسی قسم کی عصبیت، فرقہ واریت یا منافرت کا شائبہ نظر نہیں آتا۔ وہ ایک صاف اور شفاف چشمے کے مانند تھے جس سے کوئی بھی انسان سیراب ہوسکتا تھا اور جس کے پانی سے ہر کسی کی کشتِ تمنا کی آبیاری ہوسکتی تھی، یہی وجہ ہے کہ مرحوم کے چاہنے والوں میں مختلف لسانی اور نسلی گروہ سے تعلق رکھنے والے بھی ملیں گے اور مختلف عقائد و نظریات کے حامل افراد بھی۔ وہ سب سے بلا امتیاز محبت کرتے تھے اور سب اُن سے محبت کرتے تھے۔ اُن کی شخصیت کی تشکیل میں محبت اور صلح جوئی سب سے حاوی عناصر تھے۔ اِس حوالے سے اِس عظیم انسان میں اُن تمام درویش صفت بزرگوں اور صوفیائے کرام کی خصوصیات پائی جاتی تھیں جن کے دم قدم سے اِس زمین پر محبت، بھائی چارگی اور صلح و آشتی کے پھول کھلے اور جن کے سایے میں منافرتوں اور عصبیتوں کا پودا ہمیشہ بے برگ و بار رہا۔

کامریڈ بخاری کی چوراسی سالہ زندگی پر طائرانہ نظر ڈالی جائے تو ایک طلسمی انسان پیکر کا تصور ابھرتا ہے۔ اُس طلسمی انسان پیکر کی زندگی کے مختلف پہلو اور شعبے ہیں اور جس کا ہر پہلو اور ہر شعبہ یکساں تابندہ اور روشن ہے۔ وہ ایک عظیم انسان کے علاوہ ایک عظیم سیاست کار، مدبر، عظیم دانش ور، عظیم صحافی، عظیم حریت پسند، تحریکِ آزادی کے عظیم سپاہی

اور ایک عظیم سماجی کارکن تھے۔ انسانی معاشرے کو استحصال، عدمِ مساوات، غربت و افلاس، جبر و ظلم اور تمام تر ناانصافیوں سے پاک کرنے اور انسانوں کو انسانوں کے ہاتھوں استحصال سے نجات دلانے کے مشن کی تکمیل کی لگن میں اُنھوں نے اپنی طویل زندگی کا ایک بڑا حصہ برِصغیر کے جیلوں میں گزارا اور بیش تر اوقات قیدِ بامشقت سے سرفراز ٹھہرے اور شدید جسمانی اذیتوں سے دوچار کیے گئے، مگر وہ ہر آزمائش اور ہر مرحلے سے سرفراز و کامران گزرے۔ یہ امر قابلِ افسوس ہے کہ مرحوم نے اپنی عہد آفریں زندگی کے حوالے سے کوئی مربوط یادداشت ہمارے لیے نہیں چھوڑی اب یہ ہم سب کا فریضہ بن گیا ہے کہ اُن کی منتشر تحریروں کو یک جا کریں اور اُن کی ایک جامع سوانح عمری ترتیب دیں اور آنے والی نسلوں کو اُن کی کارگزاریوں اور کارناموں سے روشناس کرائیں۔ کامریڈ بخاری جیسے لوگ معاشرے میں خال خال پیدا ہوتے ہیں۔ اُن کے ورثے کو زندہ رکھنا دراصل انسانی اعلیٰ اقدار کی پاس داری اور تسلسل قائم رکھنے کے مترادف ہے۔

کامریڈ بخاری ۱۴ مارچ ۱۹۰۰ء میں بھارت کے صوبے گجرات کے شہر احمد آباد کے محلے سید واڑا میں پیدا ہوئے، گویا وہ اُس بیسویں صدی کی ابتدا میں پیدا ہوئے جو اپنی تاریخی اہمیت کے لحاظ سے ہزاروں سالوں پر بھاری ہے۔ یہ صدی جس میں عظیم سیاسی اور سماجی تبدیلیاں کرۂ ارض پر رونما ہوئیں، جس میں انسانی تہذیب و تمدن کے ارتقا کے نقوش خلاؤں میں دیکھے جاسکتے ہیں، انسان کا نقشِ پا چاند کی سرزمین پر نقشِ دوام بن چکا ہے، جس صدی میں قومی آزادی کی تحریکوں نے نئے امکانات دیکھے نوآبادیاتی نظام کا شیرازہ بکھر گیا اور آج پانچوں براعظموں کے بیش تر ممالک پر آزادی کے پرچم لہرا رہے ہیں۔ اِس صدی میں دو عالم گیر جنگوں نے جہاں تباہ کاریوں اور

ہول ناکیوں کی نئی تاریخ ترتیب دی، وہیں انسانی تہذیب وتمدن کی بقا اور تحفظ کے لیے عالمی امن کی مضبوط تحریک کو بھی جنم دیا۔ اِس صدی کے اوائل میں یورپ کے پس ماندہ ملک روس میں بالشیوک انقلاب برپا ہوا جس نے انسانی تاریخ کے سفر کو نئی جہتیں دیں انقلابِ اکتوبر کا خصوصیت کے ساتھ برِصغیر میں پُرجوش خیر مقدم کیا گیا جس کی ترجمانی شاعرِ مشرق علامہ اقبال کے اِس شعر سے ہوتی ہے:

آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا
آسماں! ٹوٹے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک؟

انقلابِ اکتوبر سے برِصغیر کے حریت پسندوں اور تحریکِ آزادی کے متوالوں کو والہانہ لگاؤ تھا۔ اِن حریت پسندوں میں مولانا حسرتؔ موہانی کا نام بھی سرِفہرست ہے جنھوں نے اپنے وطن کی آزادی کی تحریک کو حقیقی آزادی کی تحریک بنانے کے لیے انقلابِ اکتوبر کے آدرش کو عزیز تر جانا۔

نوجوان کامریڈ بخاری نے مولانا حسرتؔ موہانی کے اتباع میں انقلابِ اکتوبر کو عالمی استحصال اور سرمایہ دارانہ جبر وظلم کے خاتمے کا نقیب گردانا اور سرزمینِ انقلابِ اکتوبر کے حالات کا ذاتی مشاہدہ کرنے کی غرض سے چند نوجوانوں کا قافلہ پاپیادہ کابل اور مزارشریف کے راستے سمرقند، تاشقند اور بخارا ہوتے ہوئے ماسکو پہنچا۔ اِس قافلے کے پُرجوش ترین مسافر کامریڈ سید جمال الدین تھے۔ اِس سفر میں دو سال کا عرصہ صرف ہوا اور وہ ۱۹۲۰ء میں واپس آ گئے۔

تقریباً سات عشروں پر پھیلی ہوئی اُن کی جدوجہد سے عبارت زندگی ایک ایسی داستانِ حیات کا درجہ رکھتی ہے جس کا مطالعہ گویا ہم عصر تاریخ کا مطالعہ کرنا ہے۔ وہ ایک ایسی متحرک شخصیت تھے جن کی جولاں گاہ ساری دنیا تھی۔ اُنھوں نے ۱۹۲۴ء میں ایک

عام سیلر کی حیثیت سے دنیا کے مختلف حصوں کا دورہ کیا اور اپنے مشاہدات کے ذریعے اپنی بصیرت میں گہرائی پیدا کی ، یہی وجہ ہے کہ اُن کی داستانِ حیات میں جہاں ہمیں جنوبی ایشیا کی آزادیوں کی تحریک کے تمام تر نشیب و فراز نظر آتے ہیں ، وہیں عالمی حالات و واقعات اور تحریکوں کی پرچھائیاں بھی نظر آتی ہیں۔

مرحوم بخاری سے ہماری نیازمندی تقریباً بیس برس کی رہی ہوگی۔ لاڑکانہ میں اِس عرصے میں سیکڑوں نشستیں اُن کے ساتھ ایسی رہیں جب گھنٹوں اُنھیں سننے کا شرف حاصل رہا۔ یہ سعادتیں ہمیں 'بخاری منزل' میں حاصل رہیں اور 'بخاری منزل' کے علاوہ انصاف پریس میں جہاں سے وہ اپنے آخری ایام تک سندھی ہفت روزہ 'انصاف' اور انگریزی ہفت روزہ 'نیو ایرا' (NEW ERA) نکالتے تھے۔ وہ اُن کے دفتر سے کہیں زیادہ اُن کی ملاقات گاہ تھی جہاں کسی نہ کسی سے وہ مصروفِ کلام رہتے اور لوگوں کو ہم عصر تاریخ اور واقعات کے مختلف گوشوں سے روشناس کراتے رہتے۔ وہ گویا عصرِ حاضر کی منہ بولتی کتاب تھے جس کی اوراق گردانی سے علم و شعور کے دریچے وا ہوتے تھے اُن کی عام گفتگو بھی بڑی عالمانہ ہوتی تھی اور ساتھ ہی ساتھ پُرجوش بھی جس پر خطابت کا گمان ہونے لگتا تھا۔ گفتگو اور اظہارِ خیال میں اُن کا جوش و خروش دراصل اُن کے جذبے کی شدت اور اپنے آدرش کی سچائی پر اُن کے ایمان و ایقان کی دلالت کرتا تھا اجتماعات اور جلسوں سے خطاب کرنا اُن کا محبوب مشغلہ تھا۔ وہ عوام سے گفتگو کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ پلیٹ فارم کوئی بھی ہو، وہ اپنے خیالات و افکار کا بے باکانہ اظہار کرتے تھے:

کوئی بزم ہو ، کوئی انجمن ، یہ شعار اپنا قدیم ہے
جہاں روشنی کی کمی ہوئی ، وہاں ایک چراغ جلا دیا

کامریڈ بخاری کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے بانیوں اور سرکردہ رہنماؤں میں سے تھے۔ علاوہ بریں مرحوم بخاری سیکڑوں سیاسی، سماجی، مزدور، ہاری، ثقافتی اور تہذیبی اداروں اور تنظیموں کے بانی اور روحِ رواں تھے۔ وہ اُن افراد میں سے تھے جنھیں بجا طور پر ایک ادارہ اور ایک تحریک کہا جاتا ہے، خصوصیت کے ساتھ وہ برِصغیر کے کسان مزدور تحریک کی بنیاد رکھنے والوں اور اُن کا پرچم بلندتر رکھنے والوں میں سے تھے برِصغیر کا چپا چپا اُن کی سرگرمیوں کی آماج گاہ رہا ہے، خاص طور پر سندھ کی سرزمین سے اُن کی غیر معمولی وابستگی اور والہانہ لگاؤ اُن کی داستانِ حیات کا روشن ترین باب ہے۔ سندھ سے وہ اِس طرح وابستہ ہوئے کہ سندھ کی کوئی تحریک ایسی نہیں جس میں کامریڈ بخاری پیش پیش نہ ہوں، خواہ وہ ہاری تحریک ہو یا سندھ کی بمبئ سے علاحدگی کی تحریک۔ ساری عمر سندھ اُن کی زندگی اور سندھ کی زمین اُن کے خوابوں کی سرزمین بنی کراچی بدری کے بعد وہ مستقل طور پر لاڑکانہ میں رہے اور ۳۶ سال تک یہاں رہنے کے بعد یہیں کی زمین کا حصہ بن گئے:

آسودگانِ خاک میں شامل ہوا ہے کون
آپے میں اپنے شہرِ خموشاں نہیں رہا

کامریڈ بخاری اُن ہستیوں میں سے ایک ہیں جو لاڑکانہ کی مردم خیز زمین کی پہچان کہے جاسکتے ہیں۔ لاڑکانہ تاریخ ساز شخصیتوں کی جنم بھومی ہے۔ قومی آزادی کی تحریک کے قائدین میں سر شاہنواز بھٹو، خان بہادر کھوڑو اور قاضی فضل کے نام شامل ہیں۔ عوامی تحریکوں کے عمائدین میں کامریڈ حیدر بخش جتوئی، کامریڈ مولوی نذیر جتوئی کامریڈ عبدالقادر اور کامریڈ سید جمال الدین کے نام ہمیشہ سرِفہرست رہیں گے۔ یوں تو

بیسویں صدی کے آغاز ہی سے لاڑکانہ کو سندھ کی سیاسی اور ثقافتی زندگی میں نمایاں مقام حاصل تھا مگر سابق صدر و سابق وزیرِ اعظم پاکستان شہید ذوالفقار علی بھٹو اور وزیرِ اعظم محترمہ بےنظیر بھٹو شہید کے حوالے سے لاڑکانہ کو بین الاقوامی شہرت اور اہمیت حاصل ہوگئی۔شہید ذوالفقار علی بھٹو کامریڈ بخاری سے بڑی محبت اور عقیدت رکھتے تھے ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ کامریڈ بخاری ۱۹۷۰ء کی دہائی کے ابتدائی سالوں میں ٹی بی کے مرض میں مبتلا ہوئے تو شہید ذوالفقار علی بھٹو نے اُنھیں خصوصی اہتمام کے ساتھ علاج کے لیے کوئٹہ بھیجا تھا جہاں وہ تقریباً پانچ سال تک زیرِ علاج رہے اور مکمل صحت یابی کے بعد لاڑکانہ واپس آئے تو اہلِ لاڑکانہ نے اُن کی صحت کا جشن منایا۔

کامریڈ سید جمال الدین بخاری کی سوانحِ حیات کو قلم بند کرنے کے لیے ایک ضخیم کتاب درکار ہے۔اُس سوانحِ حیات میں ہندوستان کی تحریکِ آزادی کے مختلف ادوار اور مراحل اُس کے ابواب ہوں گے،کیونکہ وہ بیسویں صدی کی دوسری دہائی سے قبل تحریکِ آزادی میں شریک ہوگئے تھے اور غیر معمولی جوش وخروش، غیر معمولی شعور وفکر اور ایک کمٹمنٹ کے ساتھ اِس راہ کے راہی بنے تھے،سواُن کی زندگی کی کتاب تحریکِ آزادی کی تاریخ کی ایک جامع کتاب بھی ہے۔وہ کمیونسٹ تحریک سے اُس وقت وابستہ ہوئے جب ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹی اپنے قیام کے عہدِ طفولیت میں تھی۔واضح رہے کہ ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹی ۱۹۲۵ء میں کان پور میں قائم کی گئی تھی جس کی کنوینگ اور تنظیمی کمیٹی کے صدر مولانا حسرتؔ موہانی تھے اور نائبِ صدر مولانا آزاد سبحانی۔کامریڈ بخاری کا اِس پارٹی سے عملی تعلق انقلابِ اکتوبر ۱۹۱۷ء کے اوائل دور سے شروع ہوگیا تھا اِس طرح اُن کی سوانح عمری کمیونسٹ تحریک کی جداگانہ کتاب بھی ٹھہرتی ہے۔سندھ میں اُن کی آمد ۱۹۲۰ء کی دہائی کے ابتدائی سالوں میں ہوئی تھی، جب سے وہ سندھ کی ہر

تحریک کے ہراول دستے میں شامل رہے۔ یہ خود ایک علاحدہ کتاب کا موضوع ہے
قیامِ پاکستان کے بعد اُن کا سفرِ حیات بڑے نشیب و فراز سے دوچار رہا، مگر وہ کبھی
غیر متحرک نہیں رہے۔ سکوت و جمود کے مراحل سے اُن کے سفرِ حیات کا کبھی واسطہ نہیں
ٹھہرا۔ فکر و دانش کا فروغ اور اُن کی صحافیانہ زندگی بھی کتابِ زیست کے اہم ابواب
ہیں، اور یہ امر بھی ذہن نشیں رہے کہ کامریڈ بخاری کی زندگی ایک کھلی کتاب تھی
اُنھوں نے نہ تو کبھی دوہری زندگی گزاری اور نہ کبھی دوہرے معیارات کو اپنے کسی
شعبۂ حیات میں داخل ہونے دیا۔ وہ جہاں رہے اور جس تنظیم، تحریک، ادارے اور مشن
سے وابستہ رہے، کھل کر اُس کے لیے مصروفِ عمل رہے اور اُس کے اغراض و مقاصد
کے حصول کے لیے تن من دھن کی بازی لگا دی۔

کامریڈ سید جمال الدین بخاری پیروں کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جس کے
معتقدین اور پیروکاروں کی تعداد بھارت کے شہر گجرات کے مسلم بادشاہ سمیت ہزاروں
میں تھی۔ ۱۴۰۰ء میں آپ کے خاندان نے اُچ شریف (بہاول پور) سے احمد آباد
(بھارت) ہجرت کی تھی۔ ۱۹۲۳ء میں جب آپ کراچی جیل میں تھے، آپ کے والد
سید زین العابدین بخاری کا انتقال ہوا۔ وہ عربی اور فارسی کے عالم تھے، ساتھ ہی
اُنھیں انگریزی، سنسکرت، لاطینی، ہندی، گجراتی اور سندھی زبانوں پر عبور حاصل تھا
تصوف، طب اور درس و تدریس سے بھی اُنھیں شغف تھا۔ جمال الدین بخاری کی والدہ
سیدہ شریف النسا کا ۱۹۰۴ء میں انتقال ہوا جب وہ صرف چار سال کے تھے۔ اُن کی
نگہداشت کچھ عرصے تک اُن کی رشتے کی خالہ نے کی۔ ابتدائی عمر میں وہ کئی کھیلوں
کے شائق تھے۔ وہ بہت اچھے تیراک تھے، گھڑسواری، کرکٹ اور فٹ بال اُن کے
دوسرے پسندیدہ کھیل تھے۔

جمال الدین بخاری نے اپنی ابتدائی تعلیم کا آغاز چار سال کی عمر میں عربی کے ابتدائی قاعدے سے کیا۔ بچپن کے اِسی زمانے میں اپنے والد صاحب اور پھوپھی سے ابتدائی مذہبی تعلیم سمیت قرآن و حدیث اور دیگر مذہبی عقائد اور اصولوں کی تعلیم بھی حاصل کرلی تھی، سات سال کی عمر سے صوم وصلوٰۃ کے بھی پابند ہو گئے تھے ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۰ء تک ایک مشنری اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنی خاتون استاد کے ساتھ اجمیر شریف گئے جہاں وہ چھ ماہ رہے۔ ڈھنڈوکا ہائی اسکول سے ۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۴ء کے دوران جونیئر کیمبرج کا امتحان پاس کیا۔ بعدِازاں وہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ میں داخل ہوئے جہاں سے ۱۹۱۶ء میں سینئر کیمبرج اور ۱۹۱۸ء میں گریجویشن کیا۔ مولانا محمد علی جوہرؔ کی علی گڑھ میں قائم کردہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں بھی آپ نے کچھ عرصہ تعلیم پائی اور یہیں سے اٹھارہ سال کی عمر میں سیاست میں فعال طور پر حصہ لینا شروع کیا۔

سید جمال الدین بخاری نے اپنی عملی زندگی کا آغاز برِصغیر کی مختلف تحریکوں میں فعال شرکت سے کیا جس میں تحریکِ خلافت کو نمایاں اہمیت حاصل ہے۔ ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۴ء تک کا دور برِصغیر کی تاریخ کا انتہائی وقیع اور متغیر دور ہے۔ عوام کی اکثریت، جن میں زیادہ تر مسلمان تھے، برطانوی سامراجیت کے خلاف ہوگئی تھی۔ مسلمانوں کی اِس قومی بیداری میں خلافت تحریک نے راہ نمایانہ کردار ادا کیا۔

مولانا محمد علی جوہرؔ کی والدۂ محترمہ بی اماں اور مولانا شوکت علی کے ساتھ اُنھوں نے ۱۹۲۰ء میں لاڑکانہ میں منعقدہ آل سندھ خلافت کانفرنس میں شرکت کی۔ ۱۹۲۱ء میں وہ مولانا محمد علی جوہرؔ کی خواہش پر کراچی آئے اور مولانا دین محمد وفائی سے اُن کے روزنامے 'الوحید' (سندھی) کے دفتر میں ملاقات کی۔ بعدِازاں آپ نے اِس اخبار کی

چھ سال تک ادارت بھی کی۔ اِس اخبار نے برطانوی نوآبادیات کے خلاف مسلمانوں کو بیدار کرنے میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ اُنھوں نے سندھ محمڈن ایسوسی ایشن کے قیام میں بھی کلیدی کردار ادا کیا۔

کراچی سازش کیس کے تحت مولانا محمد علی جوہرؔ اور اُن کے ساتھیوں سمیت جمال الدین بخاری کو گرفتار کرلیا گیا اور اُن پر مقدمہ چلایا گیا جس کے نتیجے میں آپ کو ڈیڑھ سال قید بامشقت کی سزا ہوئی اور پانچ سو روپے جرمانہ بھی عائد ہوا، جرمانہ ادا نہ کر سکنے کی صورت میں مزید چھ ماہ کی قید کی سزا بھی شامل تھی۔ ۱۹۲۴ء میں آپ کو کراچی سنٹرل جیل سے رہائی ملی۔ رہائی کے بعد آپ نے سیمنز یونین کی بنیاد رکھی اور کارگوشپ ہنسالائن کمپنی سے فائرمین کی حیثیت سے وابستہ ہوئے۔ بعدازاں اِسی کمپنی میں سیلون بوائے کے طور پر بھی کام کیا۔ حالات نے اجازت دی تو آپ نے عدن لندن، پورٹ سعید، جبرالٹر، لیورپول اور جرمنی کا سفر بھی کیا۔

۱۹۲۵ء کے آغاز سے کامریڈ بخاری کی زندگی میں جدوجہد کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا اور وہ اِس عرصے میں نارتھ ویسٹرن ریلوے یونین کے ڈِوِژنل سکریٹری کے منصب پر فائز رہے۔ ۱۹۲۵ء میں کراچی سے اخبار 'آزادی' کا اجرا کیا اور اُس کی ادارت کے فرائض انجام دیے۔ کامریڈ بخاری نے ۱۹۲۷ء میں 'مزدور کسان پارٹی' کو منظّم کیا اور آل انڈیا مزدور کسان پارٹی کے کلکتہ کے اجلاس میں سندھ کی نمایندگی کی اُنھوں نے سندھ کی بمبئی سے علاحدگی میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ ''مسلم-ہندو معاہدہ'' پر دستخط کرنے والے راہ نماؤں میں آپ نمایاں طور پر شامل تھے۔ ۱۹۲۹ء میں بمبئی میں آپ نے جی۔ آئی۔ پی۔ ریلوے اسٹرائک میں حصہ لیا جس کے دوران میں آپ پر قاتلانہ حملے کی کوشش بھی ہوئی۔ ۱۹۳۰ء میں آپ نے راج شاہی کانفرنس میں

شرکت کی۔ ۱۹۲۹ء میں آپ نے اخبار 'چنگاری' کا اجرا کیا اور ۱۹۳۰ء میں ہفت روزہ 'ورکر' کے مدیر متعین ہوئے۔

یومِ مئی کی ایک تقریب کے بعد آپ کو ضابطے ۱۸۱۸ کے تحت حراست میں لے لیا گیا اور ہوراب جیل بھیج دیا گیا اور بعدازاں بہرام پور جیل اور پھر باکسا فورٹ جیل بھیجا گیا۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۹ء کے درمیانی عرصے میں آپ مختلف جیلوں میں رہے۔ ۱۹۳۳ء میں گرفتاری کے بعد ڈھائی سال بڑودا جیل میں رہے۔

کامریڈ بخاری مزدوروں کے حقوق کے لیے شروع ہی سے تن من دھن کے ساتھ کوشاں رہے۔ ایک مزدور رہنما نرائن داس بیچر کامریڈ بخاری کے مشورے پر ۱۹۳۵ء میں کراچی پورٹ ٹرسٹ لیبر یونین، میونسپل ایمپلائیز یونین، ٹرام وے ورکرز یونین اور سوئیپرز یونین کا قیام عمل میں لائے۔ مزدوروں کے کام میں وسائل کی کم یابی اور مالی مشکلات کو حائل ہوتا دیکھ کر ۱۹۳۶ء میں کامریڈ بخاری احمد آباد آ گئے اور اپنی کچھ جائداد صرف پانچ ہزار روپے میں فروخت کر دی اور وہ رقم لا کر مزدوروں کی فلاح و بہبود پر صرف کر دی۔ ۱۹۳۶ء ہی میں آپ نے آل انڈیا پاکستان سبھا (پارٹی) میں شمولیت اختیار کی اور کسانوں کے لیے بھرپور طور پر کام کرنا شروع کیا۔ ۱۹۳۸ء میں آپ نے تریپورہ کانگرس کے وقت 'کسان اتحادی' جلوس کی سربراہی کی اور مسلمانوں کے لیے قائم کردہ بمبئی ویلفیئر کمیٹی کے رہنما رہے۔ ۱۹۴۰ء کی پلاسا کانفرنس میں آپ کو کسان سبھا کا صدر منتخب کیا گیا۔ اِسی سال اپریل میں اُنھیں گرفتار کیا گیا اور پہلے بڑودا جیل اور پھر ناسک جیل میں قید کیا گیا جہاں سے اُنھیں اگست ۱۹۴۲ء میں رہائی ملی

کامریڈ بخاری نے فروری ۱۹۴۶ء میں نیول اسٹرائک کے حوالے سے نہایت اہم کردار ادا کیا جس نے برِصغیر کی آزادی کے لیے راہ ہموار کی۔ سندھ پبلک سیفٹی ایکٹ

کے تحت اپریل ۱۹۴۸ء میں آپ کو پھر گرفتار کر لیا گیا۔ قید و بند کی صعوبتیں مزدوروں اور ہاریوں کے حقوق کے لیے اُن کے عزمِ صمیم کو قطعاً متزلزل نہ کر سکیں۔

ایم۔اے۔او۔کالج علی گڑھ کے ہم جماعت اور دوست قاضی فضل اللہ کے مشورے اور ترغیب پر کامریڈ بخاری ستمبر ۱۹۴۹ء میں اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ لاڑکانہ منتقل ہو گئے۔ سب سے پہلے آپ قاضی فضل اللہ کی قیام گاہ پر ٹھہرے اور پھر بعد میں اُنھی کی مدد سے حاصل کردہ مکان سی۔۱۵۳۶، بخاری منزل، قائدِ عوام روڈ، لاڑکانہ میں منتقل ہوئے۔ وہ اِس مکان میں اپنے انتقال، یعنی ۱۷ر دسمبر ۱۹۸۴ء تک مقیم رہے۔

لاڑکانہ میں قیام کے دوران میں کامریڈ بخاری نے سماجی، سیاسی، ادبی اور فلاحی سرگرمیوں میں فعال طور پر حصہ لیا اور مختلف تنظیموں کے دفاتر قائم کیے۔ وہ 'بزمِ صوفیائے سندھ'، 'جمعیت الشعرائے سندھ' اور 'سندھی ادبی کانفرنس' سے بھی وابستہ رہے۔ وہ 'لاڑکانہ آبادگار ایسوسی ایشن' کے بانیوں میں سے ایک تھے جس نے ۱۹۵۷ء میں ذوالفقار علی بھٹو کی واپسی پر ایک پلیٹ فارم کا کردار ادا کیا تھا۔ آپ 'انجمنِ مدیرانِ جرائد سندھ'، 'لاڑکانہ یونین آف جرنلسٹس'، 'پریس کلب لاڑکانہ' کے رکن، 'سر شاہنواز بھٹو میموریل لائبریری کمیٹی' کے بانی رکن اور 'پریس کلب لاڑکانہ' کے تاحیات سرپرست رہے۔ ۲۳ر مارچ ۱۹۴۹ء میں آپ لاڑکانہ میں منعقدہ دسویں سندھی ادبی کانفرنس میں شریک ہوئے۔ ۱۹۵۰ء میں 'لاڑکانہ ایجوکیشن سوسائٹی' کی تشکیل ہوئی اور کامریڈ بخاری کو سوسائٹی کی ۱۵ ارکنی کمیٹی کا رُکن نامزد کیا گیا۔ ۱۹۵۰ء ہی میں 'سندھی ادبی سوسائٹی' کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اِسی سال ایک عوامی بہبود کی تنظیم 'رفاہِ عام سوسائٹی لاڑکانہ' کی تشکیل ہوئی اور کامریڈ بخاری کو اُس کا پہلا جوائنٹ سکریٹری مقرر کیا گیا مارچ ۱۹۵۱ء میں آپ کو ضلعی مسلم لیگ کانفرنس کا رُکن نامزد کیا گیا۔ جولائی ۱۹۵۱ء میں

آپ کو 'میونسپل اصلاح جماعت' کا جوائنٹ سکریٹری منتخب کیا گیا۔ اِس جماعت کے امور میں شہر کی بہبود اور خوب صورتی، لاڑکانہ میونسپلٹی کے انتخابات میں شرکت اور مسلمانوں میں سیاسی شعور پیدا کرنا شامل تھا۔ فروری ۱۹۵۲ء میں حیدرآباد میں منعقدہ سندھ مسلم لیگ ورکرز کنونشن میں آپ نے شرکت کی۔ نومبر ۱۹۵۲ء میں آپ 'لاڑکانہ اصلاح جماعت' کی طرف سے لاڑکانہ میونسپلٹی کے الیکشن میں نامزد ہوئے اور وارڈ نمبر ۳ سے میونسپل کونسلر منتخب ہوئے، فروری ۱۹۵۳ء میں لاڑکانہ میونسپلٹی کی اسکول کمیٹی کے رکن ہوئے اِسی سال لاڑکانہ شہر کے حلقۂ انتخاب عاقل، آگانی اور سنرھی سے سندھ اسمبلی کا الیکشن لڑے، ہاتھ کا نشان آپ کو تقسیم کیا گیا تھا۔ اِس الیکشن میں شریک دیگر امیدواروں میں نواب حاجی امیر لاہوری، علی گوہر کھوڑو، حافظ عبدالکریم، غلام عمر اُنڑ، احمد علی خان آگانی درگاہی شیخ اور عبدالعزیز آرائیں شامل تھے۔ علی گوہر کھوڑو رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۵۲ء میں بیگم نصرت حسن نے 'دارالصنعت لاڑکانہ' کی تشکیل کی۔ کامریڈ بخاری نے اِس انڈسٹریل ہوم کے قیام اور اِسے فعال ادارہ بنانے میں کلیدی کردار ادا کیا اور اِس کے خازن مقرر ہوئے۔ ستمبر ۱۹۵۳ء میں آپ سندھ اسمبلی بلڈنگ ہال کراچی میں منعقدہ سندھ انڈسٹریل کانفرنس میں شریک ہوئے جس کا افتتاح وزیرِاعظم محمد علی بوگرہ نے کیا۔

کامریڈ بخاری کی پہل کاری کے نتیجے میں فروری ۱۹۵۴ء میں لاڑکانہ میں 'علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن' کی تشکیل ہوئی اور لاڑکانہ کے کلکٹر نصرت حسن اُس کے پہلے صدر مقرر ہوئے۔ مارچ ۱۹۵۴ء میں کامریڈ بخاری نے لاہور میں منعقدہ آل پاکستان لوکل باڈیز کانفرنس میں ۱۵ رکنی سندھ وفد کے رکن کی حیثیت سے شرکت کی۔ اِسی سال 'عوامی خدمت گار جماعت لاڑکانہ' کا قیام عمل میں آیا اور آپ اُس کے کنوینر بنے۔ وَن یونٹ کے خلاف تحریک میں آپ نے انتہائی اہم کردار ادا کیا۔ وَن یونٹ کی مخالفت کی پاداش

میں آپ کونومبر ۱۹۵۴ء میں آپ کی لاڑکانہ کی قیام گاہ سے گرفتار کیا گیا اور سکھر جیل میں رکھا گیا۔

جنوری ۱۹۵۵ء میں کامریڈ بخاری ہفت روزہ 'انصاف' کے مدیر، طابع اور ناشر بنے جس سے آپ کی وابستگی جون ۱۹۵۰ء سے تھی۔ آپ انصاف پرنٹنگ پریس کے مالک بھی بنے۔ اِسی سال آپ نے مہاجرین اور مقامی باشندوں کے درمیان باہمی تعاون کی فضا پیدا کرنے کے لیے 'انجمنِ اتحاد' تشکیل دی اور اُس کے کنوینز مقرر ہوئے مارچ ۱۹۵۵ء میں 'جرنلسٹس ایسوسی ایشن لاڑکانہ' کے آپ نائبِ صدر مقرر ہوئے۔ اِسی سال لاڑکانہ میں منعقدہ پندرھویں سندھی ادبی کانفرنس کے منتظمین میں آپ نمایاں طور پر شامل تھے۔ دسمبر ۱۹۵۵ء میں آپ 'لاڑکانہ سندھی ادبی سنگت' کے جوائنٹ سکریٹری مقرر ہوئے۔

مئی ۱۹۵۶ء میں کامریڈ بخاری نے ہم خیال افراد کا ایک اجلاس بلایا جس میں تقریباً ۲۰۰ سیاسی وسماجی کارکنوں نے شرکت کی۔ اِسی سال سولھویں سندھی ادبی کانفرنس کے انعقاد کے موقع پر ۱۹ رکنی وفد کے آپ رکن نامزد ہوئے تاکہ مغربی پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے ارکان سے مل کر سندھی کو مغربی پاکستان کی سرکاری زبان کا درجہ دلایا جائے۔ لاڑکانہ میونسپلٹی کے معاملات دیکھنے کے لیے جولائی ۱۹۵۶ء میں خیرپور کے کمشنر نے آپ کو ۲۶ رکنی مشاورتی/انتظامی کمیٹی کے لیے نامزد کیا۔ ستمبر ۱۹۵۶ء میں گول باغ لاہور میں 'ویسٹ پاکستان کنونشن آف ری پبلکن پارٹی' کے اجلاس میں آپ شریک ہوئے اور پارٹی کے دستور اور منشور پر غور وخوض کے لیے ۲۸ رکنی سبجیکٹ کمیٹی بنائی گئی جس کے ارکان میں کامریڈ شامل تھے۔ دسمبر ۱۹۵۶ء میں حکومتِ مغربی پاکستان کے محکمۂ تعلقاتِ عامہ کے زیرِ انتظام آپ نے جرنلسٹس گروپ کے ساتھ صوبۂ سرحد کا دورہ کیا۔

جنوری ۱۹۵۷ء میں کامریڈ بخاری 'انجمنِ محبانِ وطن' کی اگزیکٹوکمیٹی کے رکن بنے جوصوبہ سندھ کی بہبود کے لیے قائم کی گئی تھی۔ دسمبر ۱۹۵۷ء میں آپ نے لاہور میں ویسٹ پاکستان لوکل گورنمنٹ اسمبلی میں شرکت کی اور جوائنٹ سکریٹری منتخب ہوئے ستمبر ۱۹۵۹ء میں آپ 'پاکستان رائٹرز گلڈ' لاڑکانہ شاخ کی اگزیکٹوکمیٹی کے رکن نامزد ہوئے۔

اپنے بڑے بھائی سید ظہور حُسین بخاری کی وفات پر کامریڈ بخاری ۱۹۶۰ء میں ہندوستان گئے۔ ہندوستان میں دورانِ قیام الہ آباد میں اُنھیں گرفتار کرلیا گیا اور وہ دو ماہ تک قید میں رہے۔ یہ کامریڈ بخاری کی آخری قیدِ زنداں تھی۔ دورانِ قید میں اُنھوں نے اپنے پرانے دوست اور اُس وقت کے ہندوستانی وزیرِاعظم جواہرلعل نہروکو اپنے کھلے عدالتی مقدمے کے لیے خط لکھا۔ پنڈت جواہرلعل نہرو نے کامریڈ کی رہائی کے سلسلے میں ذاتی دلچسپی لی اور وہ بصد احترام رہا ہوئے۔

جنوری ۱۹۶۱ء میں 'آرٹس کونسل لاڑکانہ' قائم ہوئی اور کامریڈ بخاری اُس کے بانی رکن بنے۔ فروری ۱۹۶۱ء میں وہ ضلعی ٹی بی ایسوسی ایشن لاڑکانہ کے بانی رکن رہے اور کئی سال تک اِس کے جنرل سکریٹری رہے۔

۱۹۶۲ء میں کامریڈ بخاری پر ایسا کڑا وقت آیا کہ وہ اپنے مکان کا کرایہ مبلغ پندرہ ہزار روپے بھی ادا نہیں کر پارہے تھے۔ ذوالفقارعلی بھٹو نے مدد کے طور پر ایک کوآپریٹو بینک سے اُن کے لیے قرض کا انتظام کرایا جس کا سود بعد میں اصل رقم کا دُگنا ہوگیا تھا۔

کامریڈ بخاری ہی نے ہفت روزہ اخبار 'انصاف' کی جولائی ۱۹۶۲ء کی اشاعت میں پہلی مرتبہ عوام کو یہ نعرہ دیا کہ 'قوت کا اصل سرچشمہ عوام ہیں'۔ ۱۹۶۴ء میں کامریڈ بخاری خیرپور ڈوِژنل مسلم لیگ کے جوائنٹ سکریٹری اور لاڑکانہ سٹی مسلم لیگ کے خازن

مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۵ء کے آغاز میں وہ 'زیڈ۔ اے۔ بھٹو چیری ٹیبل ٹرسٹ' کے کیرٹیکر مقرر ہوئے اور تقریباً سات سال تک اِس عہدے پر فائز رہے۔ جولائی ۱۹۶۵ء کے ضمنی انتخابات میں وہ لاڑکانہ میونسپل کمیٹی کی جرال شاہ یونین کمیٹی کے بلامقابلہ رکن نامزد ہوئے۔ اپریل ۱۹۶۶ء میں آپ لاڑکانہ میں مسلم لیگ کی تو تنظیمی کے لیے ایڈہاک کمیٹی کے رکن مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۶ء میں آپ نے ادبی تنظیم 'حلقہء ادب' قائم کی اور اُس کے تحت کُل پاکستان مشاعرے کا انعقاد کیا جس میں فیض احمد فیضؔ سمیت ممتاز شعرا نے شرکت کی۔

اکتوبر ۱۹۶۷ء میں آپ نے LARKANA URBAN COMMUNITY DEVELOPMENT PROJECTCOUNCIL کی تاسیس میں انتہائی اہم کردار ادا کیا اور اُس کے بانی جنرل سکریٹری بنے۔

۱۹۷۶ء سے ۱۹۸۴ء تک کامریڈ بخاری 'پاکستان نیشنل سنٹر لاڑکانہ' میں بڑی باقاعدگی سے بحیثیتِ مقرر شریک ہوتے رہے اور اہم قومی اور بین الاقوامی موضوعات پر بے شمار تقاریر کیں۔ اُنھوں نے بارہا پی۔ این۔ سی۔ کی تقریبات کی صدارت بھی کی اُنھوں نے آخری عوامی تقریر ۱۲ر دسمبر ۱۹۸۴ء کو آل سندھ سیرت کانفرنس لاڑکانہ کے موقع پر کی۔

کامریڈ بخاری نے نمونیا کے مرض کی پیچیدگی کے باعث ۱۷ر دسمبر ۱۹۸۴ء میں اپنی قیام گاہ بخاری منزل لاڑکانہ میں دوپہر سوا دو بجے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ آپ کو آپ کی قیام گاہ سے کچھ ہی فاصلے پر واقع سید قائم شاہ بخاری کے مزار کے قریب ۱۸ر دسمبر ۱۹۸۴ء کو دوپہر ڈیڑھ بجے سپردِ خاک کیا گیا۔ آپ کی نمازِ جنازہ ممتاز روحانی رہ نما الحاج سید غلام حُسین شاہ صاحب بخاری نے پڑھائی۔

کامریڈ سید جمال الدین بخاری کی مہد سے لحد تک کی زندگی کی روداد بیان ہو چکی ہے۔ اُن کی کثیر الجہتی اور جامعیت کی بھرپور عکاسی زیرِ نظر تحریر میں کی گئی ہے۔ اُن کی غیر معمولی متحرک اور فعال زندگی کے گوشے قارئین کو ذہن نشیں ہو گئے ہوں گے کامریڈ بخاری نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز ایک آدرش وادی، یعنی مارکس وادی کی حیثیت سے کیا اور تا دمِ آخر مارکس وادی رہے، مگر مارکسزم کے حوالے سے بھی وہ DOGMATIC نہیں تھے بلکہ غیر مقلد تھے اور بدلتے ہوئے حالات اور گزرتے ہوئے لمحات کے ساتھ مارکسزم کی تخلیقی تعبیر و تفسیر کی ہمہ وقت ضرورت اور معنویت کے قائل تھے۔ اُن کی رائے تھی کہ لینن کے بعد مارکسزم کی کسی نے حقیقی معنوں میں تخلیقی تعبیر و تفسیر نہیں کی۔ وہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی قیادت کی ایک بڑی غلطی کا بڑے پُرزور لہجے اور پُراعتماد انداز میں بارہا ذکر کرتے تھے۔ اُن کا کہنا یہ تھا کہ کلکتہ میں ۱۹۴۸ء کی کانفرنس میں پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی کے قیام کا فیصلہ کیا گیا جو سراسر غلط اقدام تھا۔ پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی کے قیام کا فیصلہ پاکستان کے بعد پاکستان کے کسی شہر میں یہاں کے پارٹی ممبروں کی کانفرنس میں ہونا چاہیے تھا۔ پاکستان میں اُس وقت سیکڑوں کمیونسٹ کارکن اور قائدین موجود تھے۔ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرح پاکستان میں گویا کامریڈ سجاد ظہیر کو گورنر جنرل یعنی سکریٹری جنرل بنا کر بھیج دیا۔ یہ خود کامریڈ سجاد ظہیر کے ساتھ بڑی زیادتی تھی۔ وہ بنیادی طور پر ادب و دانش کے قبیلے کے آدمی تھے، لیکن اُن کو پاکستان جیسے ملک کی سیاسی زندگی کی رہ نمائی کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ وہ اِس خطے کی ثقافت اور روایات سے یکسر ناواقف اور نابلد تھے، چنانچہ اُن کی قیادت میں پاکستان میں کمیونسٹ پارٹی کا پودا کیونکر بار آور ہو سکتا تھا؟ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کا جنم پاکستان کی سرزمین پر ہونا چاہیے تھا اور

یہاں کے فرزندانِ زمین کی وابستگی اور سرگرم عملی شرکت کی حکمتِ عملی اختیار کی جانے چاہیے تھی۔ سو ایسا نہیں ہوا، چنانچہ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کی ہیئتِ کذائی کسی سے مخفی نہیں ہے۔ کامریڈ بخاری کی یہ تنقید اور تجزیہ میری رائے میں نہایت صائب ہے۔غرض یہ کہ کامریڈ بخاری انگنت تنظیموں، اداروں، تحریکوں اور جماعتوں سے وابستہ رہے۔ کچھ فکری اور عملی تضادات کی نشاں دہی بھی کی جاسکتی ہے، مگر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ سب کچھ کیا جاسکتا ہے مگر اُن پر موقع پرستی اور ذاتی مفاد پرستی کی تہمت نہیں لگائی جاسکتی، جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں، اپنی سیاسی زندگی کے آغازِ سفر سے دمِ آخر تک کمیونسٹ آدرش (COMMUNIST IDEOLOGY) اُن کا MIND-SET اور طرزِ فکر و احساس کا جزوِ لاینفک رہا۔

سید جمال الدین بخاری کے پس ماندگان میں ایک بیوہ، ایک بیٹی اور آٹھ بیٹے شامل ہیں جن کے اسمائے گرامی حسبِ ذیل:

محترمہ زیب النسا بخاری عرف شانتا بخاری (بیگم)، ڈاکٹر سید مظفر سلطان بخاری حکم سید مظہر سلطان بخاری، سید منور سلطان بخاری، سید مکرم سلطان، سید کمال الدین بخاری ڈاکٹر مہر النسا بخاری، ڈاکٹر زین العابدین بخاری، سید معظم سلطان بخاری اور سید ناصر الدین بخاری۔

کامریڈ بخاری کی بیٹی اور آٹھوں بیٹے سبھی ذہین اور زیرک ہیں، گویا ''ایں خانہ تمام آفتاب است''، مگر میرے نزدیک اُن کی فکر اور نظریات کی حقیقی وارث اُن کی اہلیہ کامریڈ شانتا بخاری ہیں جو مرحوم کی جیون ساتھی ہی نہیں بلکہ اُن کی تمام تر سیاسی سماجی اور ثقافتی زندگی کی بھی ساتھی ہیں اور مرحوم بخاری کے مشن کا پرچم آج بھی اُن کے ہاتھوں میں ہے۔

# کامریڈ حیدر بخش جتوئی

۱۹۰۱ء-۱۹۷۰ء

عظیم وادیِ سندھ کی عظیم تہذیب کا گہوارہ موئن جو دڑو ضلع لاڑکانہ کے تعلقے ڈوکری میں واقع ہے۔ اِسی تعلقے کے ایک گم نام قصبے میں ایک عظیم شخصیت نے جنم لیا اور وہ گم نام قصبہ بکھو ڈیرو بیسویں صدی کی تیسری دہائی سے ایک مشہور و معروف خطۂ ارض کی حیثیت سے سندھ کے نقشے پر ابھرا اور رفتارِ وقت کے ساتھ ملک کی تاریخ کا ایک روشن باب بن گیا۔ وہ عظیم شخصیت کامریڈ حیدر بخش جتوئی کی تھی جس نے بکھو ڈیرو کو وہی حیثیت، شہرت اور عظمت بخشی جو جگرؔ نے مرادآباد کو، فانیؔ نے بدایوں کو، جوشؔ نے ملیح آباد کو، مجروحؔ نے سلطان پور کو، فراقؔ اور پروفیسر مجنوںؔ نے گورکھپور کو عطا کی۔ میں نے مذکورہ حوالے ادبی، علمی اور جغرافیائی زاویۂ نظر سے دیے ہیں۔ کامریڈ حیدر بخش جتوئی کی علمی اور ادبی حیثیت مذکورہ اکابرِ ادب کے ہم پلہ نہ سہی مگر مجموعی شخصیت کا جائزہ لیا جائے تو کامریڈ حیدر بخش جتوئی کی شخصیت سب پر بھاری ثابت ہوگی۔ وہ بلا مبالغہ

ایک نابغۂ روزگار شخصیت کے مالک تھے، اور اُن کی شخصیت کی کثیر الجہتی اُن کو وہ مقام عطا کرتی ہے جو بہت کم لوگوں کے حصے میں آتا ہے۔ وہ بیک وقت ایک عظیم دانش ورو کثیر اللسان شاعر، مصلح، انقلابی، ہاری تحریک کے سب سے بڑے رہبر اور ایک عظیم سیاست داں تھے۔ یہ اوصاف ایک شخصیت میں جمع ہو جائیں تو اُس کی عظمت کا اعتراف نہ کرنے کو مورخینِ تہذیب وثقافت اور اہلِ قلم کی محرومی کے سوا اور کیا کہا جائے گا؟

کامریڈ حیدر بخش جتوئی اپنے کارناموں، خدمات اور قربانیوں کے باوصف لاڑکانہ کا ایک بڑا حوالہ بھی ہیں، اور ساتھ ہی یہ بات بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ لاڑکانہ خود اُن کا ایک بڑا حوالہ ہے۔ لاڑکانہ کی عظمتِ دیرینہ، تاریخی اور تمدنی حیثیت کے پس منظر سے نسبت یقیناً کامریڈ حیدر بخش جتوئی کے لیے فخر کی بات ہے، مگر بیسویں صدی میں لاڑکانہ کو جو عظمت اور منفرد حیثیت حاصل ہوئی اُس میں خود اُن کا بڑا وقیع کردار ہے جو تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔

کامریڈ حیدر بخش جتوئی کی علمی اور ادبی حیثیت اور عظمت کا سورج اُن کی سیاسی زندگی کی معرکہ آرائیوں کے بادل کی اوٹ میں آکر تقریباً پس منظر میں چلا گیا اور اُن کی شاعری اور علمی کارناموں کو وہ شہرت حاصل نہ ہو سکی جس کے وہ مستحق تھے۔ یہی صورتِ حال خود لاڑکانہ کی علمی و ادبی حیثیت اور عظمت کو در پیش ہوئی۔ بیسویں صدی میں یہ شہر اور ضلع سیاسی، سماجی اور مذہبی تحریکوں کا مرکز رہا اور اِس شعبے میں اِسے ایک ایسے مرکز کی حیثیت حاصل ہوئی کہ اِس کا ثقافتی، علمی اور ادبی مرکز ہونے کا اعزاز پس منظر میں چلا گیا۔ سیاسی تحریکوں کے علاوہ خلافت تحریک کا یہ شہر ایک اہم مرکز بنا، ہجرت تحریک میں یہ شہر پیش پیش رہا اور ہاری تحریک کا یہاں عروج رہا، پاکستان کے قیام سے پہلے تحریکِ پاکستان کے قائدین میں خان بہادر کھوڑو اور شاہنواز بھٹو جیسے اہم نام تاریخ کا

حصہ بنے۔ قیامِ پاکستان کے بعد کھوڑو صاحب سندھ کے دو بار وزیرِ اعلیٰ بنے اور ایک بار وفاقی وزیرِ دفاع کے منصب پر فائز رہے۔ اِس عرصے میں یہاں کے سیاسی افق پر قاضی فضل اللہ صاحب کا نام نمودار ہوا اور وہ صوبے کے وزیرِ اعلیٰ بنے اور بعد میں مغربی پاکستان کے وزیرِ داخلہ کا عہدہ سنبھالا، چنانچہ قیامِ پاکستان کے بعد لاڑکانہ کو صوبے کا سیاسی دارالخلافہ کہا جانے لگا۔ لاڑکانہ کی سیاسی اہمیت اور شہرت کو اُس وقت چار چاند لگے جب میدانِ سیاست میں شہید ذوالفقار علی بھٹو نے اپنے قدم جمائے، ایوب خان کے دورِ اقتدار میں اہم وزارتیں سنبھالیں، وزیرِ خارجہ بن کر بین الاقوامی شہرت حاصل کی اور پھر ایوب خان سے جدا ہو کر پاکستان پیپلز پارٹی کے زیرِ قیادت ملک کی سیاست کو نئے نعروں اور نئے پروگرام کے ذریعے ایک نئی بیداری دی اور عوام میں نیا شعور پیدا کیا۔ بنگلا دیش بننے کے بعد پاکستان کے صدر اور پھر وزیرِ اعظم کی حیثیت سے اُنھوں نے لاڑکانہ کو عالمی شہرت دلائی۔

شہید ذوالفقار علی بھٹو کے عدالتی قتل کے بعد اِس گھرانے نے لاڑکانہ کا ملکی سیاست میں جس طرح مقام قائم اور بلند رکھا، وہ بھی تاریخ کے ایسے روشن ابواب ہیں کہ جن کے اُن کے مخالفین بھی معترف ہیں اور ماضیِ قریب میں شہید محترمہ بے نظیر بھٹو نے لاڑکانہ کو نئی عظمتوں سے ہم کنار کیا۔ غرض یہ کہ لاڑکانہ کی سیاسی شہرت اُس مقام پر رہی کہ اِس کی ادبی اور علمی مرکز ہونے کی حیثیت پس منظر میں چلی گئی۔ لاڑکانہ کی بیسویں صدی کی ادبی تاریخ بھی سیاسی تاریخ کی طرح غیر معمولی ہے۔ ۱۹۱۵ء میں قادری خاندان نے 'بزمِ مشاعرہ' کی بنیاد رکھی جو بعد میں 'بزمِ شعرائے سندھ' کی صورت میں سندھ کی ادبی تحریک بنی۔ ۱۹۳۰ء میں کشن چند بیوس کا شعری مجموعہ 'شیریں شعر' اور کامریڈ حیدر بخش جتوئی کا مجموعۂ کلام 'تحفۂ سندھ' شائع ہوا، اِس طرح سندھی زبان کی

تاریخ میں ترقی پسندی کے جدید دور کا تخلیقی سفر شروع ہوا۔ ترقی پسند افسانے کے تینوں بڑے نام اور بانیوں، یعنی پروفیسر ایاز قادری، جمال ابڑو اور کامریڈ سوبھو گیان چندانی کا تعلق لاڑکانہ سے ہے۔ پیر حسام الدین راشدی، پیر علی محمد راشدی، سندھی تنقید کے بانی ذوالفقار راشدی، ڈاکٹر عبدالمجید سندھی اور ڈاکٹر عبدالکریم سندیلو، یہ سب بڑے نام لاڑکانہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ 'سندھی ادبی سنگت' کی کُل سندھ بنیاد پر تشکیل اور تنظیم ۱۹۵٦ء میں لاڑکانہ کے حصے میں آئی اور پروفیسر ایاز حُسین قادری اِس کے پہلے سکریٹری جنرل منتخب ہوئے تھے۔ اِن چند سرسری حوالوں کی روشنی میں مَیں لاڑکانہ کو دبستانِ لکھنؤ اور دبستانِ دہلی کی طرح دبستانِ لاڑکانہ کہنے میں خود کو حق بجانب جانتا ہوں۔

کامریڈ حیدر بخش جتوئی ایک عظیم انسان، ایک عظیم رہ نما، مفکر اور دانش ور تھے اور اپنی ذات میں ایک تحریک تھے، اور یہ کہ سندھ کی ہاری تحریک تو اُن کے نام سے منسوب ہے ہی۔ اُن کی شخصیت کا ہر پہلو اور ہر شعبہ یکساں اہم اور جامعیت کا حامل ہے اُن کی شخصیت کی کثیرالجہتی کی تفہیم کے لیے اُن کی ذات جو ایک تحریک بھی تھی اور ادارہ بھی، اُس کا گہرا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔ اُنھوں نے سندھ کے لیے جو کارنامے انجام دیے ہیں اور سندھ کے مظلوم عوام کے لیے جو قربانیاں دی ہیں، اُن کا اعتراف سندھ کے عوام نے اُنھیں 'بابائے سندھ' کا لقب دے کر کیا ہے۔ وہ واقعی بابائے سندھ ہیں اور سندھ کے عوام کے دلوں میں اُن کے لیے جو عقیدت و احترام ہے وہ کسی دوسرے رہ نما کو حاصل نہیں۔ بیسویں صدی میں جن ہستیوں نے سندھ کی سماجی، سیاسی اور معاشی زندگی اور سندھ کی تہذیبی اور تمدنی تاریخ کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے، اُن میں بابائے سندھ کامریڈ حیدر بخش جتوئی کا نام سب سے نمایاں اور روشن ہے، کیونکہ وہ واحد سیاست داں اور سیاسی رہ نما ہیں جنھوں نے سندھ کے عوام کے حقوق کے لیے

اپنی ساری زندگی وقف کردی۔ اُن کی سیاست عوام کی سیاست تھی اور اُن کی جدوجہد عوامی حقوق کی جدوجہد تھی۔ سندھ کے ہاریوں کے لیے اُن کا قائدانہ کردار اور قربانیاں تاریخ کا حصہ بن چکی ہیں۔ 'سندھ ہاری کمیٹی' کا قیام تو بیسویں صدی کے اوائل میں کامریڈ عبدالقادر میوا خان کھوکھر کے ہاتھوں عمل میں آیا تھا مگر ۱۹۴۵ء میں جب کامریڈ حیدر بخش جتوئی نے اعلیٰ سرکاری منصب سے استعفادے کر 'سندھ ہاری کمیٹی' کی باگ ڈور سنبھالی تو یہ تحریک سندھ گیر تحریک بن گئی اور اِس نے جاگیردارانہ ایوانِ اقتدار میں ایک ہلچل پیدا کردی۔ 'سندھ ہاری کمیٹی' نے سندھ کے ہاریوں کے حقوق کی جدوجہد کے ساتھ اُن کو اپنے حقوق اور حیثیت کا انقلابی شعور بھی بخشا اور اُن میں زندگی کی نئی رمق پیدا کی۔ 'سندھ ہاری کمیٹی'، جو ہاریوں کے حقوق کی تحریک تھی، جلد ہی ہاریوں کی سیاسی جماعت بن گئی، کیونکہ اقتصادی حقوق کی جنگ سیاسی حقوق کی جنگ کے ساتھ جڑی ہوئی ہوتی ہے۔

سندھ کے ہاریوں کے حقوق کی لڑائی کے ساتھ اُنھوں نے سندھ کی قومی شناخت کی لڑائی بھی بڑی بہادری سے لڑی اور اِس شعبے میں بھی اُن کا نام سب سے نمایاں ہے۔ ۱۹۵۵ء میں وَن یونٹ کے قیام کے بعد سندھ میں وحدتِ مغربی پاکستان کے خلاف ایک زبردست لہر پیدا ہوئی، کیونکہ سندھ کے عوام کو اپنی قومی شناخت اور سندھ کی عظمتِ دیرینہ کا تفخر تحلیل ہوتا ہوا نظر آیا۔ یہ لہر اُس وقت بھی پیدا ہوئی تھی جب کراچی کو ملک کا دارالخلافہ قرار دے کر اِس کو سندھ سے علاحدہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ ۱۹۵۵ء میں وَن یونٹ کا قیام سندھ کے تاریخی تشخص اور جغرافیائی وحدت پر براہِ راست ضربِ کاری تصور کیا گیا۔ چنانچہ سیاست کاروں سے زیادہ وَن یونٹ کے خلاف تحریک میں یہاں کے ادیبوں اور قلم کاروں نے حصہ لیا اور 'سندھی ادبی سنگت'

کا کردار اِس باب میں بھی ایک خاص حوالہ ہے۔ بابائے سندھ نے سچ پوچھیے تو وَن یونٹ کے خلاف ابھرنے والی ہمہ گیر قیادت بھی سنبھالی اور سب سے زیادہ قربانیاں بھی دیں۔ اِس ضمن میں اُن کی تین نظمیں 'جیے سندھ!'، 'سندھ پیاری' اور 'سلام سندھ!' اِس تحریک کے لیے عوامی گیت بن گئیں اور جیے سندھ کا نعرہ اِس تحریک کا نعرہ بنا جو بابائے سندھ کی نظم 'جیے سندھ!' سے ابھرا اور سندھ پر چھا گیا اور سندھ کے عوام کے ہر طبقے میں یہ نعرہ جب سے آج تک گونج رہا ہے۔ یہ تاریخی نعرہ بابائے سندھ کامریڈ حیدر بخش جتوئی کا تاریخی عطیہ ہے۔ راقم کی نظم 'جیے سندھ!' کامریڈ حیدر بخش جتوئی کی فکر اور نظریاتی تحریک کی دین ہے۔ وہ نظم نذرِ قارئین ہے:

جیے سندھ!

عظیم سندھ ! تری عظمتِ دیرینہ کی خیر
تری زمیں کو سلام ، تیرے آسماں کو سلام
سلام تیری فضاؤں کو جس میں بوئے وفا
رچی بسی ہے صبا و شمیمِ گل کی طرح
محبتوں کی زمیں سندھ ! تیرا دامنِ دل
کشادہ تر ہے کسی بحرِ بے کراں کی طرح

دیارِ سچلؔ و ساحیؔ ، دیارِ شیخ ایازؔ
دیارِ لعل قلندر ، دیارِ حیدر بخش
تو ارضِ شاہ بھٹائی ، تو آسماں زمیں
بساطِ حُسن ہے دریائے سندھ کا دامن

بچھی ہے نور کی چادر تری شبستاں میں
تری زمین چمکتی ہے کہکشاں کی طرح

تو ماروی کا وطن روحِ ماروی کی طرح
جمالِ حریتِ فکر کا حسیں مینار
تو ماروی کی زمیں حُسنِ ماروی کی طرح
ہمیشہ تازہ و تابندہ و درخشندہ
فضا میں گونج رہی ہے صدائے جیے سندھ
مچل رہی ہے زباں پہ دعائے جیے سندھ

عظیم سندھ ! تری عظمتِ دیرینہ کی خیر
عظیم سندھ، تری عظمتِ دیروز کی خیر
عظیم سندھ ! تری عظمتِ امروز کی خیر
دعائے عظمتِ فردا لبوں پہ رقصاں رہے
عظیم سندھ ! تری صبح و شام خنداں رہے
عظیم سندھ ! تری عظمتِ دوام کی خیر

کامریڈ حیدر بخش جتوئی کی عام شہرت ایک کمیونسٹ نظریہ رکھنے والے رہ نما کی رہی اور وہ اپنے اِن نظریات کے ساتھ عوام کے سامنے گئے ہیں اور کبھی اپنے نظریات پر پردہ ڈالنے یا معذرت خواہانہ طرزِ عمل کا مظاہرہ نہیں کیا۔ وہ یوں باضابطہ طور پر کمیونسٹ پارٹی کے رکن نہیں رہے اور نہ انجمنِ ترقی پسند مصنّفین سے اُن کی باضابطہ وابستگی رہی مگر کمیونسٹ پارٹی اور انجمنِ ترقی پسند مصنّفین نے اُنھیں اپنا سرپرست اور اثاثہ جانا اور

اُن سے رہنمائی حاصل کی۔ بقولِ کامریڈ سوبھو گیان چندانی:

"بابائے سندھ حیدر بخش جتوئی اپنی عملی زندگی میں پاکستان کمیونسٹ پارٹی کی حکمتِ عملی اور طریقۂ کار پر نکتہ چیں بھی رہے، لیکن کمیونسٹ پارٹی نے کبھی اُن کو اپنے سے الگ یا جدا نہیں سمجھا اور اُن سے تنظیمی رابطہ برقرار رکھا گیا اور صلاح اور مشورے کا سلسلہ جاری رہا۔ خود کامریڈ حیدر بخش جتوئی خود کو فخریہ طور پر کمیونسٹ کہتے اور کہلاتے تھے۔ اُنھوں نے اپنے آخری انٹرویو میں یہ اعتراف کیا کہ وہ مارکس، اینگلز، لینن اور اسٹالن سے متاثر تھے اور اُن سے کسبِ علم و شعور کیا تھا"۔

یہ تھے کامریڈ حیدر بخش جتوئی کی عظیم شخصیت کے کچھ روشن پہلو اور تابندہ نقوش لاڑکانہ کو میں نے اپنا وطنِ ثانی قرار دیا ہے اور اس شہر کو اپنی پریم بھومی اور گیان بھومی کہتا ہوں۔ میری گیان بھومی ہونے کا اِس شہر کو جن شخصیات کے حوالے جواز حاصل ہے اُن میں کامریڈ حیدر بخش جتوئی، کامریڈ سوبھو گیان چندانی، کامریڈ سید جمال الدین بخاری اور کامریڈ مولوی نذیر حُسین جتوئی کے نام شامل ہیں۔ اِن سے میری قربتیں رہیں اور اپنے سماجی شعور اور مارکسی نظریے سے وابستگی اور قربت کے لیے میں اِنھی کا رہینِ منت ہوں ہاری تحریک کے بانی اور سندھی زبان کے شاعر، مفکر و دانش ور، بابائے سندھ حیدر بخش جتوئی سے اُس دلچسپ ملاقات کو میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا جو مرحوم قاضی فضل اللہ کے بنگلے پر ایک شام اتفاقاً ہوئی تھی۔ شام کے وقت کھلے آسمان کے نیچے احباب کے ساتھ، جسے سندھی زبان میں کچہری کرنا کہتے ہیں اور جو سندھ کی سماجی زندگی کا ایک خاصہ اور معمول ہے، ایک شام قاجی فضل اللہ مرحوم کے یہاں دیگر اشخاص کے ساتھ حیدر بخش جتوئی بھی تشریف فرما تھے۔ میں جا کر شاملِ نشست ہو گیا اور گفتگو شعر و شاعری اور مشاعرے

کی چل نکلی۔ یہ وہ دور تھا جب سندھ میں وَن یونٹ کے خلاف شدید تحریک پائی جاتی تھی، اور سندھی ادب کی ہر صنف میں یہ آواز سب سے واضح اور موثر آواز تھی حیدر بخش جتوئی نے قدرے استعجاب کے ساتھ ایک مشاعرے کا ذکر کیا جو سکھر میں کچھ مہینے قبل منعقد ہوا تھا۔ بقول اُن کے، وہاں اردو زبان کے ایک نوجوان شاعر نے 'ماروی کا دیس' کے زیرِ عنوان ایک بڑی تند و تیز نظم سنائی تھی۔ اُس نظم کے سلسلے میں وہ اپنے خوش گوار تاثرات بیان کرنے لگے۔ اِس استعجاب کا سرچشمہ یہ حقیقت تھی کہ سندھ میں بسنے والی بیش تر اردو بولنے والی آبادی وَن یونٹ کی تائید کرتی تھی اور وَن یونٹ کے خلاف تحریک کی عملاً مخالف تھی، چنانچہ ایک اردو زبان کے شاعر سے ایک ایسی نظم کا سننا جس میں سندھ دوستی کی لہریں وَن یونٹ مخالف قوتوں کے ہم سفر تھیں، یقیناً خلافِ توقع اور باعثِ استعجاب بات تھی۔ میرے ساتھ بیٹھے ہوئے اُس وقت کے نوجوان طالبِ علم رہ نما، آج کے ایک سینئر وکیل شمشیر احمد خاں نے جتوئی صاحب کی یہ گفتگو اور تاثرات سن کر اُن سے میرا تعارف کرایا کہ یہ وہی نوجوان شاعر ہے جس نے وہ نظم 'ماروی کا دیس' سکھر کے مشاعرے میں سنائی تھی۔ یہ سن کر اُنھوں نے مجھے گلے لگایا اور بڑی مسرتوں کا اظہار کیا اور میری بڑی حوصلہ افزائی کی۔ یہاں اپنی وہ نظم 'ماروی کا دیس' نذرِ قارئین کر رہا ہوں:

## ماروی کا دیس

زندگی ظلم و تشدد سے ہراساں نہ ہوئی
آگہی معرکۂ خوں سے گریزاں نہ ہوئی
روحِ بیدار کبھی خوف سے لرزاں نہ ہوئی
عظمتِ فکر زر و مال کی خواہاں نہ ہوئی

حُسن کی چشمِ سحر خیز پشیماں نہ ہوئی
ماروی شیش محل دیکھ کے شاداں نہ ہوئی

آج اِس دیس کے کچھ لوگ ہمیشہ کی طرح
چند سکّوں کے عوض عزتِ فن بیچتے ہیں
جنسِ احساسِ وفا ، دل کی لگن بیچتے ہیں
اپنی تہذیب کی حرمت کا کفن بیچتے ہیں
خونِ گل ، نکہت و تقدیسِ چمن بیچتے ہیں
ناز اِس پر ہے کہ ناموسِ وطن بیچتے ہیں

سندھ آغازِ تمدن کا درخشاں مہتاب
سندھ تاریخِ محبت کی سنہری سی کتاب
سندھ کی عظمتِ دیرینہ پہ حیراں ہے نگاہ
سندھ کی بے کسیِ حال پہ گریاں ہے نگاہ
چند لوگوں کے لیے راج بھی ہے ، تاج بھی ہے
سندھ عشرت کدۂ اہلِ ہوس آج بھی ہے

کھیت ہر سال اُگلتے ہیں خزانے لیکن
شجرِ درد کے سائے ہیں کہ بڑھتے ہی رہے
لوگ افلاس کی آغوش میں دم توڑ چلے
جہل کی رات کے گیسو کہ مہکتے ہی رہے

ہر نئی صبح یہاں غم کی خبر لاتی ہے
وقت کے پاؤں کی زنجیر بدل جاتی ہے

کامریڈ حیدر بخش جتوئی کی شخصیت کی عظمت کا سرچشمہ یوں تو اُن کی عوامی سیاست اور ہاری تحریک تھی، مگر وہ ایک انقلابی شاعر کی حیثیت سے بھی بڑی عظمتوں کے منصب پر فائز تھے۔ اُنھیں کشن چند بیوس کے ساتھ ترقی پسند سندھی شاعری کے بانیوں میں سے ایک ہونے کا فخر حاصل ہے۔

کامریڈ حیدر بخش جتوئی کا پہلا مجموعۂ کلام 'تحفۂ سندھ' ایک مختصر مجموعۂ کلام تھا یعنی ۶۳ صفحات پر مشتمل، لیکن اِس مجموعے نے اُس وقت کے معاشرے میں ایک لہر اور ہلچل پیدا کر دی اور اِس کی نظموں میں کہی گئی باتیں مذہبی حلقوں میں اِس حد تک ناپسند کی گئیں کہ مجموعے کو BAN کرنے کے لیے مطالبات آنے لگے۔

مذکورہ مجموعے 'تحفۂ سندھ' میں بائیس رباعیاں، چار غزلیں اور دیگر منظومات شامل ہیں جن میں 'شکوہ' کے علاوہ دوسری بہت اہم نظم دریائے سندھ کے حوالے سے 'دریا شاہ' ہے۔ نظم 'دریا شاہ' ایک طویل نظم ہے اور سندھی شاعری کی تاریخ میں چند اہم ترین نظموں میں شمار کی جاتی ہے۔ اِس کا منظوم اردو ترجمہ سید مظہر جمیل نے کیا ہے اور بہت خوب کیا ہے۔ وہ نظم ملاحظہ ہو:

## دریا شاہ

مرحبا اے شاہ دریا! جانِ جاں! جانانِ جاناں!
سندھ ہی کیا، تجھ سے قائم عظمتِ ہندوستاں
تو ہے فخرِ ارضِ عالم، تو ہے جنت کا نشاں
تو ہے مسکین و تونگر کا رفیقِ مہرباں

ابرِ رحمت بھی ہے تجھ سے ، وجہِ درماں بھی تو
ہے ہماری جانِ جاں تو اور ہے ایماں بھی تو
والہ و شیدا ہیں تجھ پہ سب بصد عجز و گماں
مرحبا اے شاہ دریا! جانِ جاں! جانانِ جاناں!

سندھ کی بنیاد تو ہے اور جہاں آباد ہے
موتیوں کی چھم چھما چھم آسماں آباد ہے
تجھ سے خوش بختی کا وابستہ نشاں آباد ہے
یا تخیل کا کوئی باغِ جناں آباد ہے
اِس کنارے پر بسے ہیں یا اُدھر آباد ہیں
تیرے دامن میں قبیلے ہر طرف آزاد ہیں
ہیں فرنگی ، سندھی ، جاپانی و ہندی یک زباں
مرحبا اے شاہ دریا! جانِ جاں! جانانِ جاناں!

مرحبا ! ہے پاک گنگا کا سرِ آغاز تو
دیکھتا دریائے جمنا کے بھی ہے سب ناز تو
اور ہے برہم پتر دریا کا بھی دمساز تو
شاہدِ فطرت بھی تو ہے ، کاشف و ہمراز تو
ایک عالم ہو گیا ساحل پہ تیرے خیمہ زن
عربی و عجمی ہوئے آپس میں سرگرمِ سخن
فرق کیا ہے مشرق و مغرب کے آخر درمیاں
مرحبا اے شاہ دریا! جانِ جاں! جانانِ جاناں!

مان سرور جھیل سے نکلا ہے تو گاتا ہوا
اور پھر کشمیر میں اترا ہے اٹھلاتا ہوا
آیا ہے باغِ عدن کو جیسے مہکاتا ہوا
سندھ کی دھرتی پہ گویا رقص فرماتا ہوا
راحتِ قلب و نظر تیرا ہر اک انداز ہے
اور ہاں ! کیلاش پربت بھی ترا دمساز ہے
زندگی پرور ہے تیرا ہی وجودِ مہرباں
مرحبا اے شاہ دریا! جانِ جاں ! جانانِ جاناں!

کس طرح ہے پیچ وخم سے مضطرب کوہسار میں
کیسی شوریدہ سری ہے قوتِ رفتار میں
جب مگر آتا ہے تو میداں گہِ پنجاب میں
ایسے لگتا ہے کہ جیسے سو گیا ہو خواب میں
اونچی نیچی سب زمینوں کو کرے سیراب تو
جھیل ، دریا ، ندیاں اور چاہیاں تالاب تو
اے عظیم الشان رودِ آب ! اے موجِ رواں!
مرحبا اے شاہ دریا! جانِ جاں ! جانانِ جاناں!

دیکھ ! وہ دوڑے چلے آتا ہے راوی دید کو
اور ستلج مل رہا ہے جیسے روزِ عید کو
آکے جہلم پاؤں سے لپٹتا ہے کس تمہید کو
گویا ملتے ہیں یہ باہم سب تیری تجدید کو

ہو کے ضم تجھ میں سبھی پھرتے ہیں کیا سرشار سے!
وصل کے لیتے مزے ہیں گویا اپنی ہار سے
ہیں سبھی تیرے پجاری، تو ہے عظمت کا نشاں
مرحبا اے شاہ دریا! جانِ جاں! جانانِ جاناں!

مرحبا اے شاہ دریا! سندھ میں تیرا ورود
پوری وادی ہے ازل سے شکر میں سر بسجود
ذرہ ذرہ بھیجتا ہے تجھ پہ صدیوں سے درود
تجھ سے ہی قائم و دائم ہے سدا اِس کا وجود
اے مرے سندھو! ہمیشہ سندھ پہ رکھنا کرم
رشتۂ مہر و وفا دائم رکھے سب کو بہم
سندھ تو کچھ بھی نہیں تیرے سوا، اے مہرباں!
مرحبا اے شاہ دریا! جانِ جاں! جانانِ جاناں!

آخرش تو جا گرا ہے بحرۂ زخار میں
غم زدہ ہے ایک عالم وادی و کوہسار میں
تو ہوا بےاَنت ساگر کا شریک اسرار میں
سب رموزِ خودشناسی عالمِ پندار میں
ہے ازل سے تا ابد فیضِ رواں جاری ترا
ذرے ذرے پر یہاں احسان ہے بھاری ترا
کر دیا بنجر زمیں کو سبزۂ باغِ جناں
مرحبا اے شاہ دریا! جانِ جاں! جانانِ جاناں!

تیرا پہلا گھر یقیناً بحرۂ زخار ہے
عشق کی آتش سے تو ابرِ سرِ کوہسار ہے
آسماں در آسماں موجِ ہوا رہوار ہے
پھر ہمالہ پہنچ کے تو آبِ گوہردار ہے
مینہ بن کر موجِ دریا میں بدل جاتا ہے تو
وادی وادی گھوم کے پھر اپنے گھر آتا ہے تو
گردشِ ایام کا چکر سدا سے ہے رواں
مرحبا اے شاہ دریا! جانِ جاں! جانانِ جاناں!

تجھ پہ ساون میں سدا چھا جاتی ہے مستی سی کیا؟
جھومتی ہے ساری خلقت تجھ پہ ہو ہو کے فدا
چپا چپا تو نے یوں آباد و روشن کر دیا
لہلہاتی کھیتیوں کو چاولوں سے بھر دیا
کر دیا سیراب تو نے کوہ و ریگستان کو
بھر دیے ہیں ندی نالے، جھنگ اور میدان کو
چار مہینے شادمانی کے مناظر ہیں یہاں
مرحبا اے شاہ دریا! جانِ جاں! جانانِ جاناں!

تو کہ ہے عیسیٰ نفس ہر نہر، ہر اک واہ میں
چشمۂ آبِ رواں کھولے ہیں تو نے چاہ میں
بھر دیے آبی ذخیرے ہر شکاری گاہ میں
تیرے ساحل کہ خضر بیٹھے ہوں جیسے راہ میں

سبزہ زار و باغ و گلشن میں عجب مہکار ہے!
ڈالی ڈالی میں پرندوں کی بسی چہکار ہے
تو نے دکھلائے مناظر دل فریب و شادماں
مرحبا اے شاہ دریا! جانِ جاں! جانانِ جاناں!

اپنی تیزی میں نہیں رہتا مگر تجھ کو خیال
تیرے سیلابوں سے خلقت کتنی ہوتی ہے نڈھال
کھیتیاں برباد، فصلیں سب کی سب ہیں پائمال
دیکھ لوگوں کے مصائب، اپنی موجوں کو سنبھال
کھیت کھلیاں ڈوبتے ہیں، بستیاں غرقاب ہیں
تیری ہی بخشی ہوئی خوش حالیاں غرقاب ہیں
رکھ عنایت کی نگاہ، اے موجۂ آبِ رواں!
مرحبا اے شاہ دریا! جانِ جاں! جانانِ جاناں!

جو سفینے تیرے سینے پہ ہیں صدیوں سے رواں
اُن کو اندیشہ ہے کوئی اور نہ ہے کوئی گماں
نوح کی کشتی کے مانند چومتے ہیں آسماں
اُن میں حیدؔر بھی چلا ہے، الاماں! خیر الاماں!
وہ ترا اوجِ کمال افروز، وہ موجِ رواں
کس نے پایا ہے نصیب ایسا مقدر سے یہاں
اے کہ تو عظمت نشاں، عظمت نشاں، عظمت نشاں
مرحبا اے شاہ دریا! جانِ جاں! جانانِ جاناں!

مذکورہ نظم کا سرچشمۂ بالیدگی ''رگ وید'' میں 'او سندھو دریا!' کے عنوان سے الہامی اظہار ہے:

**او سندھو دریا!**

(''رگ وید'' سے اقتباس)

'' ○ سندھو ....گھوڑوں کی دولت سے مالا مال ہے ○ رتھوں کے بیڑوں سے مالا مال ہے ○ زرق برق کپڑوں کی فراوانی سے مالا مال ہے ○ غلے ، ریشم کے انبار اور شیشم کے سرسبز و شاداب درختوں کے جُھنڈوں سے مالا مال ہے ○ اِس کے مقدس کناروں پر خوش ذائقہ شہد پیدا کرنے والے پھولوں کے تختے مہکتے ہیں۔

○ اے سندھو! تو اپنی روانی میں آگے ہی آگے دوڑتا چلا جاتا ہے کہ خوش حالی کے دیوتا نے دھرتی پر تیری گزرگاہ متعین کر دی ہے ○ تو اناج کی افزودگی کے مقصد کو دھیان میں رکھے بلندیوں سے نشیب کی وادیوں میں بہتا جاتا ہے اور اِس طرح سب عالم پر راج کرتا ہے۔

○ اے سندھو! تو برق رفتاری کے ساتھ دریائے گومتی سے پہلے 'ترشتما' ندی کو ساتھ لیتا ہے اور پھر 'سرتو'، 'رسن' اور 'شویتی' ندیوں سے مل کر دریائے 'کبھا' اور 'میہتنو' کے بہاؤ میں شامل ہو کر اگلی منزلوں کی طرف روانہ ہوتا ہے۔

○ اے سندھو! تیری موجوں کی گھن گرج زمین سے آسمان تک پہنچتی ہے، تیری بپھری ہوئی لہروں میں زندگی کی برق رفتار روانی اور

بہاؤ ہے، اور جب گرجتے بادل تجھ پر برستے ہیں تو تُو کسی حاملہ عورت کی طرح اٹھلا اٹھلا کر چلتا ہے۔

○ اے سندھو! دوسری ندیاں دودھ دیتی ہوئی گایوں کے مانند ہیں جو اپنے بچھڑوں کو دودھ پلانے کے لیے بے چینی کے ساتھ دوڑتی ہیں اور تو کناروں کے بیچ اچھل اچھل کر اُن کی یوں رہ نمائی کرتا ہے جیسے کوئی سیناپتی یا راجا جنگ کرنے کے لیے یلغار کرتا ہو۔

○ ہمیشہ رواں دواں سفید جھاگ اُڑاتے شفاف چمکتے پانیوں والے سندھو دریا! تیرا بہاؤ سرکش اور کرشماتی گھوڑوں کی طرح تیز و تند ہے اور تیرا روپ ایسا ہے جیسے کوئی خوش جمال حسینہ۔

○ جل دیوتا تیرے شایانِ شان استقبال کے لیے سات سات ندیوں کو تیری پیشوائی میں حاضر رکھتا ہے کہ تو ایک عالم کو سیراب کرتا رہے ○ سندھو عمدہ اور پُر وقار گھوڑوں والی رتھ پر خوش خرامی کے ساتھ بہے چلا جاتا ہے اور ہمارے لیے اناج کے ڈھیر لگائے گا تا ہے۔

○ ہم اِس عالی شان رتھ والے سندھو کا جُگ جُگ خیر مقدم کرتے ہیں''۔

(پروفیسر ولسن [انگریزی]، ولی رام ولبھ [سندھی]، سید مظہر جمیل [اردو])

مذکورہ نظم 'دریا شاہ' کی اہمیت خو کا مریڈ جتوئی کے نزدیک اِس قدر تھی کہ اُنھوں نے خود اِس کا منظوم انگریزی ترجمہ کیا جو اُن کی انگریزی زبان و ادب پر گرفت کے ساتھ اِس زبان میں تخلیقی جوہر کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ وہ منظوم انگریزی ترجمہ بھی نذرِ قارئین ہے:

## THE RIVER KING

O SOUL OF SINDH!, O GRACE OF GOD!,
O BEAUTY, DECORATION AND POMP OF HIND!,
O PRIDE OF THE WORLD!, O SIGHT OF GOD!,
THE SHELTER OF THE RICH AND THE POOR!,
O CLOUD OF KINDNESS!, O GLAMOUR OF GOODNESS!,
MY LOVE AND ZEST, EVERY MOMENT SAY,
WELCOME TO THEE, O RIVER KING! A THOUSAND WELCOMES.
THY ROOTS ARE THRONE OF THE WORLD,
WHEREVER THY INCESSANT RAIN OF PEARLS BEFALLS,
ETERNAL FORTUNE FLOWS ALONG THY CURRENT,
THOU ART THE HEAVENLY TREE IMPLANTED ON EARTH,
WHOEVER SEEKS FINDS WHEREVER HE BE,
BE HE OF EUROPE, INDIA, JAPAN OR SINDH,
OUT OF A MOT GENEROUS PARADISE, COMEST THOU,
WELCOME TO THEE, O RIVER KING! A THOUSAND WELCOMES.
THE HOLY GANGES HAS ITS SOURCE FROM HERE,
THE BLANDISHMENT OF JAMUNA ARISES FROM THEE,
BENGAL MIXES BEATH WITH BRAHMA HERE,
THE SECRET OF GOD IS UNFOLDED IN THEE,
THE EARTH WITH HEAVENS, THE ARABS WITH GARDENS,
DO MEET HERE AND ALSO BECOME OPPONENTS,
HERE DIFFRENCE BETWEEN EAST AND WEST IS NONE,
WELCOME TO THEE, O RIVER KING! A THOUSAND WELCOMES.

THOU TRAVELLEST FROM MANSUROUER TO KASHMIR,

ASSUMING THE SHAPE OF THE GARDEN OF THE EVE,

AND FILLEST IT WITH THOU PERFUME OF EXCELLENCE,

CARRYING HAPPINESS IN THE HEART, FOOD FOR KAILAS,

THOU ART THE COMFORT OF HEART, FOOD FOR SOUL,

BRINGING SWEETS AND MILK FROM THE MOUNT KAILAS,

AND PLENTY OF GARDENS AND ORCHARDS, ALL THAT IS GREEN,

WELCOME TO THEE, O RIVER KING! A THOUSAND WELCOMES.

CLEAVING MOUNTAINS, THOU REACHEST THE PUNJAB,

IT'S THERE THOU GOEST QUIETLY TO REST,

AND IN THE SLEEP THOUS FILLEST IT WITH WATER,

WATER OF STILLINESS, NOT OF WHIRIPOOL AND CURRENT,

GONE ARE THY FALLS, DESCENTS AND UPROAR,

MAKING NEW CURRENTS ARE STREAMS THOU GLIDEST SMOOTHLY,

OH! RUNNING SOUL, MISTRESS OF HONOUR AND GREATNESS,

WELCOME TO THEE, O RIVER KING! A THOUSAND WELCOMES.

THE RIVER RAVI COMES TO SEE FACE,

AND SUTLEJ AND JHELUM MAKE OBEISANCE,

THEY GO MADE AFTER THY GREAT UPROAR,

AND FALT HEADLONG AT THY HOLY FEET,

AND LOSE THEIR EXISTENCE IN THEE,

FULFILLING THUS ENTEREST THE VALLEY OF SINDH,

WELCOME TO THEE, O RIVER KING! A THOUSAND WELCOMES.

FINALLY, THOU ENTEREST THE VALLEY OF SINDH,

FOR WHICH THOU HAST THE GREATEST LOVE,

EARLY AT MORN SINDHI DOTH BOW TO THEE,

AND WORSHIPS THEE AND TREATS THEE AS GUIDE,

O"SINDHU KEEP SINDH AFRESH FOREVER,

BEAR THAT NAME, BE FAITHFUL TO IT ALWAYS.

SINDH WITHOUT SINDHU IS BODY WITHOUT SOUL,

WELCOME TO THEE, O RIVER KING! A THOUSAND WELCOMES.

AT LAST, THOU LOSEST THY SOUL IN THE SEA,

FREED FOREVER FROM MOUNTS AND ROCKS,

AND BREATHE THE ETERNAL BREATH OF THE OCEAN,

AND DISAPPEAR IN SELFLESSNESS,

THOU ART THE ETERNAL ONE, ALL BELONG THE THEE,

THOU ART THE SOURCE OF ALL, ALL THINGS BELONG TO THEE,

BOTH DRY AND MIST GET COLOUR AND LIFE FROM THEE,

WELCOME TO THEE, O RIVER KING! A THOUSAND WELCOMES.

ORIGINALLY, THY HOME WAS THE SEA,

THE FIRE OF LOVE MADE YOU TRAVEL ABROAD,

THOU WANDERED OVER MANY CITIES AND TOWNS,

TOOK YOUR ORIGINAL SHAPE ON TOP OF HIMALAYAS,

AND FLOWED FROM THERE TO THE SEAS,

THE SEA WAS YOUR BIRTH AND THE SEA TOOK YOU BACK,

THE WORLD IS A CIRCLE GOING UP AND DOWN,

WELCOME TO THEE, O RIVER KING! A THOUSAND WELCOMES.

IN "*SAUWAN*"'S RAIN THOU WEAREST GREEN,

FILLING PEOPLE'S MINDS WITH CEASELESS JOY,

EARTH IS CARPETED OVER WITH BLACK,

AND EVERY NICHE GETS THICK AND THICKER STILL,

AND DRINKING THY WATER PRODUCES GRAIN,

CANALS OVERFLOW AND SPREAD OVER FIELD AND WASTE,

AND EVERY INCH IS FILLED WITH WATER,

WELCOME TO THEE, O RIVER KING! A THOUSAND WELCOMES.

THOU POUREST THE BREATH OF CHRIST IN EVERY STREAM,

EVERY BROOK GURGLES WITH DELIGHT,

THY ETERNAL WATERS FLOW ON FOREVER,

AND KHIZR'S STEPS ARE SEEN EVERYWHERE,

JUNGLES TURN INTO GARDENS AND GARDENS FILL WITH LUSTRE,

EVERY SHRUB DAZZLES AND BIRDS BREAK INTO SONG,

AND ALL EYES ARE ENCHANTED BY THE SIGHT,

WELCOME TO THEE, O RIVER KING! A THOUSAND WELCOMES.

IN SUMMER, THY JOY KNOWS NO BOUNDS,

YOUR EMBRACE REACHES THE PADDY FIELDS,

YOUR CURRENT BREAKS ALL BARRIERS AND BUNDS,

GOD SAVES THE ONE WHO CROSSES THY PATH,

DESERTS TURN OCEANS AT THY BEHEST,

RIPENED CORN-FIELDS, FLOODED HOUSES FALL,

BE NOT SO CRUEL IN EXCESS OF JOY,

WELCOME TO THEE, O RIVER KING! A THOUSAND WELCOMES.

THY BOAT TOUCHES THE LOFTY SKIES,

AND BUMBLE HYDER ENTERS IT IN HOPE,

THAT THINE IS THE TRUE "NOAH'S ARC",

WHOSE SAILS REACH THE TOPMOST HEAVEN,

THY WAVES ARE WONDERFUL AND FULL OF DELIGHT,

HOMAGE TO THY GREATNESS, HOMAGE TO THY MIGHT,

AND POUR LIFE INTO THE EYES OF MEN,

WELCOME TO THEE, O RIVER KING! A THOUSAND WELCOMES.

شعری مجموعے 'تحفۂ سندھ' کی ایک اور اہم نظم 'شکوہ' ہے۔ یہ وہ دور تھا جب علامہ اقبال کی نظم 'شکوہ' ادبی حلقوں کے ساتھ ساتھ مذہبی حلقوں میں بھی موضوعِ بحث بنی ہوئی تھی اور مذہبی حلقوں کی طرف سے اُنھیں کفر و الحاد کے فتووں کا سامنا تھا، سو اُنھوں نے 'جوابِ شکوہ' لکھ کر مذہبی تنگ نظری اور راسخ العقیدگی کے حلقوں سے اپنی جان چھڑائی۔ کامریڈ حیدر بخش جتوئی کی نظم 'شکوہ' بھی اُن کے لیے اِسی قسم کی صورتِ حال پیدا ہونے کا باعث بنی اور کفر و الحاد کے فتووں سے اُنھیں بھی نوازا گیا مگر کامریڈ جتوئی نے پسپائی اختیار نہیں کی اور اُنھوں نے کسی معذرت خواہانہ رویے کا اظہار کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اِس نظم کے آخری چھ بند نذرِ قارئین ہیں اِس نظم کا انگریزی ترجمہ بھی خود کامریڈ جتوئی کے تخلیقی جوہر کا کرشمہ ہے:

A COMPLAINT

"THY INFIDELS ARE IN REJOICINGS, SHOW SENSE OF HONOUR,

THY SEEKERS ARE SUFFERING PAINS SHOW SOME LOVE,

THY DEVOTEES ARE DYING OF THIRST, SHOW SOME MERCY,

SHOW SOME DIFFERENTIATION IN THY FRIENDSHIP AND THY ENMITY,

PEOPLE ARE SAYING, FROM ALL SIDES IN HUNDREDS:

MAN HAD BETTER BEEN WITHOUT SUCH AN ALLAH

SAY: WHO ELSE IS THERE TO LOOK AFTER THY ORPHANS?

WHO ELSE CAN FEEL ANXIETY ABOUT ALLAH'S SLAVES?

AFTER WANDERINGS HERE AND THERE, WE ARE WITHOUT A WAY OR MEANS:

ON ALL THE FOUR SIDES WE ARE FACED BY THY COURT.

SAY: TO WHAT OTHER GOD SHALL WE CARRY OUR CRY?

DO SOME GUIDANCE TO THY SLAVES, OH GOD!

OH GOD! ART THOU MY CREATOR OR AM I THY CREATOR?

OR AM I ONLY THE WITNESSS OF THE TRUTH,

THY VOCAL MANIFESTATION?

WHAT RELATIONSHIP DOES SUBSIST BETWEEN ME AND THEE,

OH! THE ABSOLUTE CREATOR?

IN THIS REFLECTION IS PINING AND MELTING THY LOVER,

WHAT SHALL I CALL MYSELF, AND WHAT

SHALL CALL THEE, OH FRIEND?

WHAT SHALL I CALL "ALL IS HE." OR SHALL

I SAY: "ALL IS NAUGHT?"

OH THOU! WHO GAVE ME LIFE A HEART AND A SOUL!

OH THOU! WHO BESTOWED ON ME REASON, UNDERSTANDING AND DOUBT?

OH THE HEART AND SOUL OF THE WORLD, A MASTER WITHOUT ALIKE!

DO THOU NOT BE ANGRY WITH MY TAKING LIBERTIES?

I HAVE ALWAYS PAID HOMAGE TO THEE,

FROM ANETERNITY HAVE I ACCEPTED THY SLAVERY?

FROM MY COMPLAINTS MANIFEST MY WORTH,

MY WEAKNESS, MY IGNORANCE AND MY FOLLY,

MY GOD! I AM REDUCED TO A VERY BAD STATE,

EVERYWHERE THERE IS A COMPLAINT AGAINST ME,

IF THERE IS A COMPLAINT AGAINST ME, AGAINST
WHOM IS THE COMPLAINT?

IF THERE IS MY PRAISE, OH SIRE! WHOSE PRAISE IS IT?

LOVE FOR THY HUMANITY - THIS IS MY RELIGION.

THEIR DELECTATION AND SERVICE - THIS IS MY LIFE-OBJECTIVE

THY WONDEROUS WORLD - THIS IS MY SCHOOL TO LEARN,

TO BE THE CREATION OF A LORD LIKE THEE - THIS IS MY DIGNITY.

SUCH AS I AM, I AM THINE, OH ALLAH!

NONE IN THE WORLD OWNED HYDER AS HIS, BY ALLAH!

’تحفۂ سندھ‘ کے بعد اُن کا دوسرا مجموعہ’ آزادیِ قوم‘ کے نام سے ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا۔ یہ طویل نظم پانچ مصرعوں یعنی مخمس کی شکل میں ۱۷۱ بندوں پر مشتمل ہے ’آزادیِ قوم‘ جنگِ آزادی کی منظوم داستان ہے، اِسے انگریزی نوآبادیاتی تسلط کے خلاف ہندوستان کی جدوجہدِ آزادی کے ایک رزمیے کا درجہ حاصل ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اُنھوں نے اپنی سیاسی جدوجہد میں اپنی شاعری سے بھرپور استفادہ کیا، گویا اُن کی سیاست اور شاعری کا ایک دوسرے سے چولی دامن کا ساتھ تھا

اُن کی شاعری کی قدر وقیمت کو اُن کی عظیم سیاسی جد و جہد کے تناظر میں دیکھنا اور پرکھنا چاہیے۔ خصوصیت کے ساتھ وَن یونٹ کے خلاف اُنھوں نے متعدد نظمیں لکھیں جنھوں نے اِس تحریک میں نئی توانائیاں اور قوتِ متحرکہ پیدا کیں، خصوصاً اُن کی مشہور نظم 'جیے سندھ! جیے سندھ!'۔ یہ نظم تحریک کی زبان بنی اور نعرہ بن کر فضاؤں پر چھا گئی۔ اِس نظم کے حوالے سے اُن پر مقدمات قائم ہوئے اور اُنھیں برسوں قید و بند کی صعوبتوں سے دوچار رہنا پڑا۔ بات سپریم کورٹ تک پہنچی جس نے ایک مضبوط فیصلے کے ذریعے حکومت کے موقف کو رد کر کے اُنھیں باعزت طور پر بری کیا۔ مذکورہ نظم سپریم کورٹ کے فیصلے کا حصہ بنی تھی، یعنی اِس کا انگریزی ترجمہ۔ وہ نظم درجِ ذیل ہے:

ON YOU SINDH! THOUSAND *SALAM,S*

MAY YOU BE HAPPYAND *BAGH-O-BAHAR* FOR EVER!,

MAY YOU REMAIN ENCHANTED IN PEACE!,

LONG LIVE SINDH! LONG LIVE SINDH!

EVERY HUMAN BEING IS OUR BROTHER,

THIS IS OUR *IMAN* (FAITH),

THIS IS OUR ISLAM,

LONG LIVE SINDH! LONG LIVE SINDH!

INTRIGUE AND JELOUSY BE *BARBAD*,

"AFFECTION AND LOVE, *ZINDABAD*!"

THIS IS OUR *PAIGHAM*,

LONG LIVE SINDH! LONG LIVE SINDH!

LONG LIVE SINDH! LONG LIVE SINDH!

LET SINDH DRINK BOWL OF LOVE,

LET*KHAS-O-AAM* DRINK THIS BOWL

LONG LIVE SINDH! LONG LIVE SINDH!

LONG LIVE SINDH! LONG LIVE SINDH!

LONG LIVE SWEET LIFE! (LOVABLE-BEING).

EVERYWHERE,

LET LOVE SPRING OUR *AAM-O-JAM*

LONG LIVE SINDH! LONG LIVE SINDH!

کامریڈ جتوئی کی شاعری کے غائر مطالعے کے بعد صاحبانِ نقد و نظر کی یہ رائے ٹھہرے گی کہ حیدر بخش جتوئی کی شاعری میں انسانی جذبات کی تندی اور گرمی بھری ہوئی ہے۔ وہ خیالات کی دنیا میں رہنے کے بجائے زمینی حقائق کو اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں۔ جذبات کی شدت نے اُن کے کلام میں روانی اور طاقت پیدا کر دی ہے۔ وہ آسان اور سلیس مگر معیاری زبان لکھتے ہیں۔ اُن کے اسلوب اور تخیل میں سندھ کے دیہات کی فضا اور خوشبو رچی بسی ہے۔ حب الوطنی حیدر بخش جتوئی کا دوسرا بڑا وصف ہے، چنانچہ اُن کی ہر نظم میں سندھ کے عوام اور خصوصاً مظلوم طبقات کے لیے ہمدردی کی شبنم گھلی ہوئی ہے۔ حُسن و عشق کے جھوٹے جذبات اور مصنوعی موضوعات سے اُنھوں نے دانستہ گریز کیا ہے، لیکن فطرت کی خوب صورتی اور انسانی محنت کی عظمت کے تصورات سے ایک نئے احساسِ جمال کو اپنی شاعری میں سمویا ہے۔

کامریڈ حیدر بخش جتوئی BORNGENIUS تھے۔ اُنھوں نے اپنی تعلیمی زندگی کے آغاز ہی سے اپنے GENIUS ہونے کا مظاہرہ کر دیا تھا، چنانچہ تعلیمی مدارج جست کی صورت میں طے کرتے ہوئے ہر مرحلے میں نمایاں حیثیت سے کامیابیاں حاصل کیں ۱۹۲۸ء میں ریونیو کے شعبے میں ملازمت سے اپنے کیریر کی ابتدا کی اور ۱۹۴۵ء میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز تھے کہ اُنھوں نے اپنی شان دار ملازمت کو، جو اُس دور

میں بڑے دبدبے اور شان و شوکت کا منصب تھی ، خیر باد کہا اور سندھ کے عوام خصوصیت کے ساتھ سندھ کے مظلوم اور دوسرے استحصال اور جبر و ستم کے شکار ہاری طبقے کی خوش حالی ، بھلائی اور معاشی آزادی کی جد و جہد کے لیے خود کو وقف کر دیا گویا گوتم بدھ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے اپنے عیش و آرام اور شان و شوکت کو تج کر کے انسانیت کی خدمت پر خود کو مامور کر لیا اور زندگی کے آخری لمحے تک اُنھوں نے اپنے اِس مشن اور آدرش کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائے رکھی۔ کڑی سے کڑی آزمایشوں سے گزرے، مگر وہ نہ کبھی مایوس ہوئے اور نہ کبھی عوام کو مایوس کیا۔ کامریڈ حیدر بخش جتوئی بائیں بازو اور ترقی پسند سیاست کے ایک عظیم لیڈر تھے۔ وہ اُس قبیلے کے ایک مختار رکن تھے جس قبیلے سے سید سجاد ظہیر اور حسن ناصر جیسی عظیم شخصیات کا تعلق تھا جنھوں نے اپنا سب کچھ تج کر خود کو DE-CLASS کر لیا اور مظلوم انسانیت کے لیے جد و جہد سے بھرپور زندگی گزار کر زندۂ جاوید ہو گئے۔

کامریڈ حیدر بخش جتوئی کی شخصیت اور شاعری کے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہونے کے باوجود یہ بات اپنی جگہ برحق ہے کہ اُن کی سیاسی شخصیت اور عظمت کے مقابلے میں ہم اُن کی شاعرانہ شخصیت اور عظمت کو ہم پلہ قرار نہیں دے سکتے۔ وہ ایک بہت بڑے انسان تھے اور اپنے آدرش، جد و جہد اور قربانیوں کی روشنی میں اُنھیں سندھ کی تاریخ کی ایک اہم شخصیت اور باب ہونے کا منصب حاصل ہے۔ بیسویں صدی میں خاص طور پر اِس ضمن میں دو نام سامنے آئے ہیں، یعنی جی۔ ایم۔ سید اور کامریڈ حیدر بخش جتوئی۔ اِن دونوں نے سندھ کے لیے جو کارنامے انجام دیے ہیں اور جو جد و جہد کی ہے، وہ تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں۔ دونوں بڑے سیاسی رہبر ہونے کے علاوہ اپنے عہد کے INTELLECTUAL GIANTS تھے۔ اِنھوں نے کئی

نسلوں کو اپنے نظریات اور افکار سے متاثر کیا ہے۔ دونوں SECULAR THINKER تھے
جی۔ ایم۔ سید کے سیکولرزم کی بنیاد تصوف پر استوار تھی، جبکہ کامریڈ حیدر بخش جتوئی
کے سیکولرزم کا ماخذ اور سرچشمہ مارکسزم تھا۔ کامریڈ حیدر بخش جتوئی کا ایک بڑا علمی اور
فکری کارنامہ اُن کا مطالعۂ قرآن اور اُس کا حاصلِ مطالعہ (SUBSTANCE OF THE
HOLY QUR'AN) ہے۔ وہ مذہب کو تعقل پسندی اور خردافروزی کے دائرے میں دیکھنے
کے خواہاں تھے۔ وہ منقولات کے بجائے معقولات کے پرچارک تھے۔

کامریڈ حیدر بخش جتوئی کا جیے سندھ کا نعرہ سندھ کی قومی شناخت کے ساتھ سندھ
کے مظلوم عوام کے مفادات کے لیے جدوجہد کا نعرہ تھا، جبکہ جی۔ ایم۔ سید کی جیے
سندھ کی تحریک اور نعرہ سندھی قومیت کا وہ نعرہ ہے جس میں سندھ کے جاگیردار طبقے کے
مفادات کو سندھ کے مظلوم عوام کے مفادات پر برتری حاصل ہے۔ کامریڈ حیدر بخش جتوئی
کا جیے سندھ کا نعرہ سندھ کے مظلوم عوام کی جدوجہد کا نعرہ ہے، محض سندھی قومیت کا
نعرہ نہیں۔ یہ نعرہ سندھ کے پرولتاریا کا نعرہ ہے، سندھ کے جاگیردار اور بورژوا طبقے کے
مفادات کے تحفظ کا نعرہ نہیں ہے۔

حیدر بخش، جتوئی قبیلے کے ایک زمیندار گھرانے میں ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۱ء کو پیدا ہوئے
تھے۔ ابتدائی تعلیم اُنھوں نے لاڑکانہ میں حاصل کی اور ۱۹۲۳ء میں یونیورسٹی آف بمبئی
کے لاڑکانہ سنٹر سے میٹرک کا امتحان دیا اور پورے صوبۂ بمبئی میں فرسٹ کلاس
حاصل کی۔ ۱۹۲۷ء میں اُنھوں نے ڈی جے کالج سے بی۔ اے آنرز پاس کیا اور وہ اعلیٰ
سرکاری ملازمت میں لے لیے گئے۔ ابتدا میں اُنھوں نے مختارِ کار کی اسامی پر کام کیا
اور مختلف منازل سے ہوتے ہوئے وہ ڈپٹی کلکٹر ہو گئے، اُس زمانے میں جو ضلع کا
سب سے بڑا عہدہ تصور کیا جاتا تھا، لیکن شروع ہی سے اُنھیں بائیں بازو کی سیاست

سے ہمدردی تھی۔ اُنھیں ہندوستان میں جاری قومی آزادی کی تحریکوں سے بہت گہرا دلی لگاؤ تھا، اس لیے اُنھوں نے ۱۹۴۵ء میں سرکاری ملازمت سے استعفا دے دیا اور اپنے آپ کو قومی و سماجی نوعیت کی سرگرمیوں کے لیے وقف کر دیا۔ اُنھیں اِس بات کا احساس تھا کہ سندھ کے ہاری اور کسان انتہائی کسمپرسی کی زندگی گزار رہے ہیں، اُن کی معاشی، معاشرتی، سماجی، سیاسی اور علاقائی صورتِ حال ہندوستان بھر کے کسانوں اور کاشت کاروں کے مقابلے میں نہایت ہی ناگفتہ بہ تھی۔ صوبے کی ۸۰ فی صد قابلِ کاشت اراضی پر جاگیردار اور زمیندار متصرف تھے جو ہاریوں سے بٹائی اور بیگار میں کاشت کرواتے تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ ہاری تیار فصل میں سے صرف ایک چوتھائی فصل کا حق دار تھا اور ساری فصل زمیندار اور اُس کے کارندے اٹھالے جاتے تھے، اُس میں سے بھی زمیندار کے کارندے، دال، مقدم، نمبردار اور محکمۂ آب پاشی اور زراعت کے بے رحم عمال اپنا اپنا حصہ بٹاتے تھے۔ چنانچہ سال بھر کی محنتِ شاقہ کے بعد بھی ہاری کی قسمت میں مٹھی بھر دانے ہی ہوتے تھے جو اُس کی اور اُس کے اہلِ خاندان کی سال بھر کی کفالت کے لیے قطعی ناکافی ہوا کرتے تھے۔ زمیندار اور جاگیردار براہِ راست زرعی پیداوار میں حصہ نہ لیتے تھے اور نہ وہ ہاری کو دوسری ضروری سہولتیں فراہم کیا کرتے تھے۔ غیر حاضر زمینداری (ABSENTEE-LANDLORDISM) کا سب سے مضبوط اور ظالم نظام سندھ ہی میں قائم تھا جسے حکومتی، سیاسی، مذہبی اور اخلاقی اداروں کی مکمل اعانت اور پشت پناہی حاصل رہی ہے۔ سندھ میں ہاریوں کی زبوں حالی کا اندازہ قائدِ اعظم کی قائم کردہ سندھ ہاری انکوائری کمیٹی رپورٹ سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ یہ کمیٹی چار ارکان پر مشتمل تھی سر راجر ٹامس بطورِ مشیرِ زراعتِ حکومتِ سندھ اِس کمیٹی کے چیرمین تھے اور محمد مسعود آئی۔ سی۔ ایس کلکٹر نواب شاہ، نور الدین صدیقی منیجر انکم ٹیکس بورڈ

حکومتِ سندھ اِس کمیٹی کے ارکان تھے اور آغا شاہی اِس کمیٹی کے نامزد سکریٹری تھے اِس رپورٹ میں ڈپٹی کلکٹر نواب شاہ محمد مسعود (جو بعد میں عرفِ عام میں مسعود کھدر پوش کہلائے) کا اختلافی نوٹ ایسے واشگاف حقائق وشواہد سے پُر تھا کہ وزیرِاعلیٰ سندھ محمد ایوب کھوڑو کو، جو خود بھی ایک بہت بڑے زمیندار تھے، اِس اختلافی نوٹ کی اشاعت پر پابندی عائد کرنی پڑی تھی۔ جب بعد میں اِس اختلافی نوٹ کے کچھ حصے اِدھر اُدھر شائع ہوئے تو اِس کی زبردست گونج پیدا ہوئی، تب حکومت کو بھی سندھ کی صورتِ حال کا نوٹس لینا پڑا۔ مسعود کھدر پوش کی ہاری رپورٹ تفصیلی، مدلل اور تحقیقی مواد کی حامل ہے جس کا اندازہ مندرجۂ ذیل اقتباسات سے لگایا جاسکتا ہے:-

''ہاری جو کئی نسلوں سے زمین پر کاشت کرتا چلا آیا ہے، اُسے یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ اُس زمین پر جس میں اُس کا اور اُس کے اجداد کا خون پسینا جذب ہوا ہے، کب تک کاشت کر سکے گا۔ خوف اُس کی زندگی کا لازمی جزو ہے۔ اپنی قید و بند کا خوف، زمین، زندگی اور بچوں سے جبراً علاحدہ کرا دیے جانے کا خوف۔ اُسے ہمیشہ خوف لاحق رہتا ہے کہ کہیں زمیندار کسی ناکردہ بات پر خفا نہ ہو کہ اُسے اور اُس کے خاندان کو زمین سے بے دخل نہ کر ڈالے، کیونکہ ایسی صورتِ حال میں کوئی دوسرا زمیندار بھی اُس کو پناہ دینے کا روادار نہ ہوگا اور اُسے بغیر کسی مہلت کے اپنی پکی پکائی فصل، ڈھور ڈنگر اور آبائی گاؤں تک چھوڑ دینا پڑتے ہیں۔ اِن حالات میں بے دخل ہاری کو جسمانی تشدد اور مار دھاڑ کا بھی شکار بننا پڑتا ہے اور اُسے اور اُس کے اہلِ خاندان کو چوری چکاری، ڈاکا زنی بلکہ قتل

تک کے جھوٹے مقدمات ہی میں پھنسادیا جاتا ہے یا اور کچھ نہ ہو تو دفعہ ۱۱۰ کے تحت نقضِ امن کے جھوٹے مقدمے میں ملوث کر کے حوالات میں بند کر دیا جاتا ہے۔ کسی بھی طرح کی حکم عدولی کا اندیشہ اور شائبہ تک ہاری کو زمیندار کی قہرسامانی کا شکار بنانے کے لیے بہت کافی ہوتا ہے، اور زمیندار کو ہاری اور اُس کے خاندان پر مکمل اختیار ہوتا ہے کہ وہ جب چاہے اُس سے اپنے کنویں کھدوا سکتا ہے، مکان بنوا سکتا ہے یا اِسی نوع کی کوئی بھی دوسری بیگار بغیر کسی اجرت اور معاوضے کے لے سکتا ہے اور ہاری اور اُس کے متعلقین کی یہ مجال نہیں ہوتی کہ وہ زمیندار یا اُس کے کارندوں کے احکام کی بجاآوری میں کسی طرح بھی سستی دکھانے کی جسارت کر سکے"۔ ☆

"اگر ہاری کی بیوی خوب صورت ہے تو ایسی صورت میں خود ہاری کی زندگی کو خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں اکثر ہاری کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی خوب صورت بیوی کو اپنی مرضی کے ساتھ زمیندار کے حوالے کر دے، ورنہ خطرناک نتائج بھگتنے کے لیے تیار ہو جائے۔ اگر ہاری اپنی بیوی کو زمیندار کے پاس بھیجنے پر راضی نہ ہو پائے تو پھر اُسے جبراً اغوا کر لیا جاتا ہے اور اُس کی جبراً عصمت دری کی جاتی ہے۔ اِس قسم کے معاملات میں مزاحمت کرنے والے ہاری کو قتل تک کر دیا جاتا ہے اور کوئی اُس کا پرسانِ حال تک نہیں ہوتا"۔ ☆

"میں نے کوئی ہاری ایسا نہیں دیکھا جو ایک زمیندار کے سامنے سیدھا کھڑا ہو سکے یا جس نے جھکے بغیر یا زمیندار کے پاؤں کو ہاتھ لگا کے

سلام نہ کیا ہو۔ انسانیت کی جو تذلیل اور درگت سندھی زمیندار کے ہاتھوں ہوتی ہے، اُس کا نہ کوئی قانونی جواز ہوتا ہے اور نہ معاشرتی و اخلاقی بنیاد ہوتی ہے"۔

☆

"ہاری زمیندار کے سامنے بیٹھنے کا حوصلہ نہیں رکھتا اور نہ زمیندار کی چارپائی اور دوسرے سامان کو بغیر اجازت چھو سکتا ہے۔ نام نہاد پیر اور مولوی، زمینداری اور جاگیرداری نظام کے خادمِ خاص ہوتے ہیں جن کا کام یہی ہوتا ہے کہ وہ ہاری کو صبر کی تلقین کرتے رہیں اور اُسے مذہب کے نام پر یہ باور کراتے رہیں کہ جو ذلت و خواری اُس کی قسمت میں خدا نے لکھ دی ہے، ہاری کسی بھی قیمت پر اُس زبوں حالی سے نجات حاصل نہیں کرسکتا۔ اِس معاشرے میں ہاری کا مقام نہایت ارزل درجے پر فائز ہے اور اُس کی دادرسی کا کہیں کوئی امکان نہیں"۔

حیدر بخش جتوئی نے اپنی ملازمت کے دوران میں سندھ کے ہاریوں اور کسانوں کی حالتِ زار کا خود مشاہدہ کیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ہاری دوطرفہ مظالم کا شکار ہیں ایک طرف زمیندار اور اُس کے کارندے اُسے تختۂ مشق بناتے ہیں، دوسری طرف حکومتی ادارے اُسے اُس کے قانونی حق تک سے محروم رکھتے ہیں۔ خود ہاری ظلم سہنے کا عادی ہو چکا ہے اور اُس میں اپنے اوپر ہونے والے مظالم کے خلاف آواز اٹھانے تک کی ہمت نہیں رہی۔ وہ اپنے قانونی اور اخلاقی حقوق سے لاعلم ہے۔ وہ تعلیم اور زندگی کی دوسری ضروریات سے قطعی طور پر محروم کر دیا گیا ہے، چنانچہ حیدر بخش جتوئی نے اعلیٰ سرکاری نوکری سے استعفا دے کر سندھ کے ہاری اور کسان میں زندگی کا شعور پیدا

کرنے والی ہاری حق دار تحریک چلائی اور اپنی باقی زندگی سندھ کے ہاریوں اور کسانوں کو منظم کرنے اور اُن میں اپنے قانونی حقوق اور سماجی مرتبے کے حصول کے لیے جدو جہد کرنے کا شعور پیدا کرنے کی ذمہ داری لی۔ اُنھوں نے سرکاری ملازمت سے سبک دوش ہونے کے بعد ۱۹۴۵ء میں اپنا یادگار ہفت روزہ اخبار 'ہاری حق دار' نکالا جو دیکھتے دیکھتے سندھ کی بائیں بازو کی سرگرمیوں سے دلچسپی رکھنے والوں اور عوامی فلاح و بہبود کے ہم نواؤں میں مقبول ہوتا چلا گیا۔

وہ زندگی کے آخری لمحے تک اپنے مشن کی تکمیل کے لیے سرگرداں رہے اور اپنی جدوجہد جاری رکھی اور وہ جیتے جی ایک LEGEND بن گئے۔ اِس مضمون میں اُن کی ادبی اور شاعرانہ زندگی مرکزِ توجہ رہی ہے۔ اِس مضمون کا اختتام اُن کی ایک اردو نظم 'سلام سندھ!' پر کر رہا ہوں جو اُن کی شاعری کے بنیادی وصف، جس کا اوپر ذکر آیا ہے، کی حامل ہے:

سلام سندھ!

شکارِ عیش بند ہو ، کلامِ حق بلند ہو
علوم کا ، فنون کا شعاع ہو ، سگند ہو
حسین کاروبار سے ہر ایک ارجمند ہو
مزدور ہاری پائے حق ، جہدِ محن سے قند ہو
عمل قدمِ حیات اور عیش میں ممات ہے
اے سندھ! تجھ پہ جاوداں سلام ہے، صلات ہے
اٹھو ، اٹھو اے سندھیو ! لو! کندھوں پر کفن کرو
''فنا میں ہے بقا'' ، بپا تم ایسی انجمن کرو

سعید سندھ سے یہی سچا پکا وچن کرو
دیکھو! ویت نام میں اُنھوں نے کیا کیا ہے
جہاں یہ احتجاج ہے کہ خودکشی نجات ہے
اے سندھ! تجھ پہ جاوداں سلام ہے، صلات ہے

اے بے خبر، ستم گر! تو ہم سے جنگ بند کر
کہاں کے بھائی، بھائی پر تبر تفنگ بند کر
جفا کے جیل توڑ، سوخت پتنگ بند کر
تو چھوڑ جان سندھ کی، یہ ڈھونگ ڈھنگ بند کر
اصول بھائی چارے کا خلوصِ التفات ہے
اے سندھ! تجھ پہ جاوداں سلام ہے، صلات ہے

کیوں سندھ سے ہے دشمنی؟ قدیم پاک نام ہے!
کبھی بدلتا مٹتا ہے حلال حق حرام کا؟
وفا و دھوکا کب تلک چلے گا یہ عوام سے؟
کیوں زور، ظلم، جبر، سب ہیں جاری احتشام سے؟
کرے جو تجھ سے دشمنی، تحمینہ ہے کذات ہے
اے سندھ! تجھ پہ جاوداں سلام ہے، صلات ہے

تخلیقیت اور تخلیقی عمل، یعنی شاعری قدرت کی ودیعت ہوتی ہے۔ بڑے مفکر دانش ور، ناقد اور ادیب کا منصب انسان اپنی سعیِ مسلسل، محنتِ شاقہ، لگن اور جستجو سے حاصل کرسکتا ہے، مگر قدرت کی عطا کے بغیر کوئی بڑا شاعر نہیں بن سکتا۔ موزونیِ طبع اور

تخیل، شاعری کے لیے اساس کا درجہ رکھتے ہیں۔ دیگر خداداد صلاحیتوں کے ساتھ
قدرت کی طرف سے شاعری بھی کامریڈ جتوئی کے خمیر میں شامل کی گئی تھی جس کا اظہار
بہت کم عمری سے شروع ہو گیا تھا۔ ۱۹۳۰ء میں اُن کے پہلے شعری مجموعے 'تحفۂ سندھ'
کا شائع ہونا اِس بات کا ثبوت ہے کہ اُنھوں نے کس عمر سے مشقِ سخن شروع کر دی تھی
مگر شاعری محض اُن کے اظہارِ ذات کا مسئلہ نہ تھا اور نہ اُن کے ذوق وشوق کا معاملہ تھا
شاعری اُن کے نزدیک عملِ پیغمبری تھا۔ شاعری اُن کے مشن اور مسلک جس کے لیے
اُنھوں نے اپنی ساری زندگی وقف کر دی تھی، کو آگے لے جانے اور اُس انقلابی جدو
جہد کو فروغ دینے اور اُس کی ترجمانی کرنے کا وسیلہ تھی۔ بحیثیت ایک مصلح اور ہاری
تحریک کے عظیم قائد، وَن یونٹ کے خلاف چلنے والی تحریک میں کلیدی کردار ادا کرنے
اور اِس تحریک کو جیے سندھ کا نعرہ دے کر اِسے کامیابی سے ہم کنار کرنے کے تفخر میں
شاعری اُن کی ہم سفر اور ہم نفس بنی رہی۔ وہ امن اور محبت کے پرچارک تھے، مگر اُن کی
شاعری میں اردو کلاسیکی شاعری کی محبت جیسی کوئی شے نہیں ملے گی اور نہ خیالی معشوق
ملے گا، بلکہ اُن کے ہاں محبت، انسانیت سے محبت، سندھ سے محبت، سندھ کے مظلوم
اور استحصال زدہ عوام سے محبت کے روپ میں ملے گی اور یہ دائرہ پھیل کر کرۂ ارض پر
انسانوں کی بھاری اکثریت کا خواب بن گیا تھا۔ وہ اپنے گھر والوں کے لیے آئیڈیل اور
ماڈل شخصیت تھے۔ اِسی شخصیت کا عکس اُن کی شاعری میں نظر آتا ہے جو قارئین کے دل
میں اُن کی محبت اور عقیدت کے جذبات پیدا کرتا اور پروان چڑھاتا ہے۔

# کامریڈ مولوی نذیر حُسین جتوئی

۱۹۰۳ء-۱۹۷۴ء

کامریڈ مولوی نذیر حُسین جتوئی کی شخصیت ہر اعتبار سے متاثرکن تھی۔ وہ اپنی صورت اور سیرت، یعنی ظاہر و باطن کی خصوصیات کے باوصف ایک غیرمعمولی شخصیت تھے۔ اُن کے حوالے سے جب بھی سوچ کا نگر آباد ہوا تو ہندوستان کی تین عظیم شخصیتوں کی تصویریں ذہن کے افق پر ابھریں: مولانا حسرتؔ موہانی، مولانا آزاد سبحانی اور مولانا اسحاق سنبھلی۔ مولانا حسرتؔ کی شاعرانہ عظمت تو خیر تسلیم شدہ ہے مگر اُن کی غیرمعمولی شخصیت کا روشن ترین پہلو یہ ہے کہ وہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے بانیوں میں سے ایک تھے۔ ۱۹۲۵ء میں کان پور یوپی میں جب کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کا تاسیسی اجلاس منعقد ہوا تو اُس کی استقبالیہ کمیٹی کے وہ چیرمین تھے اور مولانا آزاد سبحانی وائس چیرمین۔ مولانا حسرتؔ موہانی کی غیرمعمولی خدمات ترقی پسند تحریک کے حوالے سے بھی تاریخ کا حصہ ہیں۔ اُن کا یہ شعر زباں زدِ خاص و عام ہے:

درویشی و انقلاب مسلک ہے مرا
صوفی مومن ہوں ، اشتراکی مسلم

مولانا آزاد سبحانی آزاد ہندوستان ۱۹۴۷ء سے تادمِ آخر ۱۹۵۷ء تک ایک تحریک چلاتے رہے جس کے پلیٹ فارم سے وہ ہندوستان کے مسلمانوں کو اجتماعی طور پر کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا میں شرکت کی دعوت دیتے رہے۔ اُن کا استدلال یہ تھا کہ آزاد ہندوستان میں مسلم کمیونٹی کا مستقبل حقیقی سیکولر جمہوری ہندوستان سے وابستہ ہے اور اُن کے خیال میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا واحد حقیقی سیکولر جمہوری پارٹی ہے۔ وہ انڈین نیشنل کانگرس کے سیکولر کردار کے حوالے سے شدید تحفظات رکھتے تھے میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے تقریباً ایک عشرے تک مولانا آزاد سبحانی کی صحبت سے فیض حاصل کرنے کے مواقع میسر آئے۔ اُن کے حوالے سے مشہور بھارتی کمیونسٹ رہنما ڈاکٹر ادھیکاری نے ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام 'RED MOULANA'، یعنی سرخ مولانا ہے مولانا اسحاق سنبھلی سے ۱۹۸۶ء میں پہلے پہل لکھنؤ میں منعقدہ انجمنِ ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی کانفرنس میں ملاقات ہوئی تھی۔ مولانا اسحاق انڈیا کی مرکزی کمیٹی کے رکن تھے۔ مولانا سادگی اور سچائی کا پیکر تھے۔ کامریڈ مولوی نذیر حسین جتوئی کے تصور کے ساتھ ایک اور عظیم شخصیت کا دھیان، یعنی مولانا عبیداللہ سندھی کی شخصیت اور اُن کی جدوجہد کے نقوش ذہن پر ابھرے، شاہ عنایت شہید کی تاریخ ساز شخصیت کی بھی تصویر ابھری جنھیں جناب سبطِ حسن نے وادیِ سندھ کا سوشلسٹ صوفی کہا ہے۔

جیسا کہ بیان ہو چکا ہے کہ ۱۹۶۰ء میں میرا لاڑکانہ آنا ہوا اور یہ شہر میرا شہر، یعنی وطنِ ثانی نہیں بلکہ میری گیان بھومی اور پریم بھومی بن گیا۔ میں اپنے استاد پروفیسر

سنت لال سنگھ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے سوکس اور پولیٹیکل سائنس کے مضامین کی کلاسوں میں نصابی مواد پر اظہارِ خیال کے ساتھ ساتھ مارکسی نقطۂ نظر سے بھی اِن اسباق میں کھل کر اظہار کرتا تھا، چنانچہ میری نظریاتی وابستگی یعنی ترقی پسندیت اور بائیں بازو کے افکار و خیالات سے وابستگی کالج اور کالج سے باہر شہر کے باخبر حلقوں میں جلد ہی عام ہوگئی اور گاہے گاہے کالج کا آئی بی سے تعلق رکھنے والا عملہ میرے حوالے سے پوچھ گچھ کے لیے آنے لگا، گویا میرا اعمال نامہ کھل گیا اور میری پہچان ایک سرخے کے طور پر ہوتی چلی گئی۔

لاڑکانہ کو سندھ کا سیاسی دارالخلافہ کہا جانا کوئی بے معنی اظہار اور شاعرانہ بیان نہیں بلکہ پوری بیسویں صدی میں رونما ہونے والے سیاسی مد و جزر اور تحریکیں جو سندھ میں ابھریں، اُن کا براہِ راست تعلق لاڑکانہ سے تھا۔ خلافت تحریک سے لے کر بمبئی سے سندھ کی علاحدگی کی تحریک تک لاڑکانہ کو ایک مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔ یہاں کی سیاسی شخصیات جو قومی دھارے کی تحریک سے وابستگی کے باوصف یہاں کی سیاسی تاریخ میں اہمیت کی حامل ٹھہریں، اُن میں سرشاہنواز بھٹو، خان بہادر محمد ایوب کھوڑو قاضی فضل اللہ، شہید ذوالفقار علی بھٹو، مولانا جان محمد عباسی اور شہید محترمہ بے نظیر بھٹو کے اسمائے گرامی سرِفہرست ہیں۔ اِن کے علاوہ یہاں کی سیاسی شخصیات کی ایک بڑی فہرست ہے۔ اِس فہرست سے ہٹ کر کچھ غیر معمولی سیاسی شخصیات بھی ہیں جن کی سیاسی سرگرمیوں کا محور عام انسان، یعنی ہاری اور مزدور تھے جنھوں نے سندھ دھرتی کے مظلوم طبقات کے CAUSE کے لیے خود کو وقف کیا تھا، قربانیاں دی تھیں اور عظیم جد و جہد کی تھی۔ اِس فہرست کے چار اہم ترین نام ہیں: کامریڈ حیدر بخش جتوئی، کامریڈ سید جمال الدین بخاری، کامریڈ مولوی نذیر حُسین جتوئی اور کامریڈ سوبھوگیان چندانی

جنھیں ہم نے 'لاڑکانہ کے چہار درویش' کے نام سے اِس کتاب کا موضوع بنایا ہے۔

کامریڈ مولوی نذیر حُسین جتوئی مذکورہٗ بالا چہار درویشوں میں سے ایک درویش ہیں۔ میرا لاڑکانہ سے ۱۹۶۰ء سے رابطہ، رشتہ اور ناتا ہے۔ میں ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۲ء تک لاڑکانہ کے کالج آف کامرس اینڈ اکنامکس میں شعبۂ سیاسیات سے وابستہ رہا تھا اور کالج کے تدریسی فرائض کے علاوہ غیر تدریسی شعبوں کی ذمہ داری بھی مجھے سونپ دی گئی تھی چنانچہ کالج میگزین کے چیف اڈیٹر، طلبا یونین اور کالج لائبریری کے انچارج پروفیسر کی حیثیت سے میں کالج میں بے حد فعال رہا تھا، اور ساتھ ہی ساتھ شہرِ لاڑکانہ کی ادبی تنظیموں 'بزمِ ادب لاڑکانہ'، 'سندھی ادبی سنگت' اور 'انجمنِ ترقیِ اردو لاڑکانہ' سے گہری وابستگی رہی۔ 'انجمنِ ترقیِ اردو لاڑکانہ' کے زیرِ انتظام شاہ لطیف لائبریری کے قیام و تعمیر میں بھی میرا کلیدی کردار رہا تھا۔ علاوہ بریں جز وقتی صحافی کی حیثیت سے لاڑکانہ کی سیاسی شخصیتوں اور سیاسی حلقوں سے بھی میرا مسلسل ربطِ باہم رہا۔ اپنے قیام کے دوران میں مختلف ادوار میں مَیں نے لاڑکانہ میں 'نوائے وقت' لاہور، 'اے پی پی' اور روزنامۂ 'جنگ' کے نمایندے اور انگریزی روزنامے 'سن' (SUN) کے نامہ نگار کے فرائض انجام دیے تھے، خصوصیت کے ساتھ ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے زمانے میں 'اے پی پی' کے ساتھ روزنامۂ 'جنگ' کی اضافی ذمہ داری مجھے تفویض کی گئی تھی۔ اِس دوران میں پیپلز پارٹی کی اعلیٰ قیادت، خصوصیت کے ساتھ قائدِ عوام ذوالفقار علی بھٹو سے میرے بڑے قریبی رابطے رہے۔ اِن وابستگیوں سے قطعِ نظر میری نظریاتی وابستگی بائیں بازو کی جماعتوں سے پیدا ہوئی اور میں باضابطہ طور پر کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان سے وابستہ ہو گیا اور لاڑکانہ ضلع کا ۱۹۷۲ء تک ضلع سکریٹری رہا۔ واضح رہے یہ کمیونسٹ پارٹی اِس عرصے میں زیرِ عتاب رہی تھی اور غیر قانونی تنظیم تھی اور اِس کے بہت ہی محترم قائد، یعنی

حسن ناصر کو لاہور کے قلعے میں اذیتوں سے دوچار کر کے قتل کیا گیا تھا، کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ ساتھ ۱۹۵۰ء کی دہائی کے ابتدائی حصے میں انجمنِ ترقی پسند مصنّفین اور D.S.F بھی غیر قانونی قرار دے دی گئی تھیں۔ گویا یہ دورِ ابتلا اپنے عروج پر تھا اور اِس پارٹی اور اِس کے نظریے سے وابستگی اور اُس کا پرچار خود کو خطراتِ واقعی سے دوچار کرنا تھا، پھر لاڑکانہ جیسے شہر میں جو ۱۹۶۰ء میں بہت کم وسیع وعریض شہر تھا اور آبادی کے لحاظ سے بھی بڑا شہر کہلانے کا مستحق نہیں ٹھہرتا تھا، مگر اِس شہر کی غیر معمولی سیاسی اور تاریخی اہمیت اپنی جگہ مسلم تھی۔ لاڑکانہ اپنے حدود اربع اور آبادی کے لحاظ سے ایسا شہر تھا کہ یہ کہنا غلط نہ تھا کہ یہاں کمیونسٹ پارٹی کے لیے کچھ کرنا گویا فوری طور پر خفیہ اداروں کی نظروں میں آجانے کے تمام تر امکانات روشن کرنا تھا۔ بہر حال اِن تمام تحفظات اور اندیشہ ہائے دور و دراز سے بے نیاز ہو کر میں اس قبیلۂ کشتگاں کا رکنِ رکین بن گیا۔

اشتراکیت، یعنی مارکسزم سے میری شدبد اور جان کاری کا آغاز ۱۹۵۲ء سے شروع ہو گیا تھا جب میں پٹنہ (قدیم پاٹلی پتر) کے ایک کالج بہار نیشنل کالج کے فرسٹ ایر کا طالبِ علم تھا۔ میرے مضامین میں دیگر مضامین کے علاوہ سوکس بھی شامل تھا جو اگلی کلاسوں میں پولیٹیکل سائنس یعنی علمِ سیاسیات کہلایا۔ سوکس کے پروفیسر سنت لال سنگھ نے، جو بہار کی کمیونسٹ پارٹی کی صوبائی کمیٹی کے رکن تھے، پہلے دن سے نصابی تقاضوں کی تکمیل کے ساتھ ساتھ مارکسزم کے مختلف گوشوں پر بھی روشنی ڈالنی شروع کر دی، اور وقت کے ساتھ اُن کی کلاس میں مجھے مارکسزم کی اچھی خاصی تفہیم حاصل کرنے کا موقع میسر آیا اور پھر جوزف اسٹالن کی سوانح عمری پڑھنے کا موقع ملا اِس حقیقت کے انکشاف نے کہ جوزف اسٹالن ایک COBBLER کے بیٹے تھے، یعنی ہندوستان کی نہایت نچلی اچھوت ذات، چمار خاندان کے چشم و چراغ تھے، میرے

جہانِ فکر و دانش میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ ہندوستان کے مخصوص سماجی اور تاریخی تناظر میں مسلم کمیونٹی بھی ذات پات کی تمیز و تفریق سے دوچار ہوئی اور ہندو کمیونٹی کی طرح مسلم کمیونٹی میں بھی اعلیٰ اور ادنیٰ ذات پات کی ایک دیرینہ روایت قائم ہو چکی تھی اور میرا تعلق بھی مسلم کمیونٹی کے اشرافیہ طبقے سے نہیں بلکہ محنت کش طبقے سے تھا، یعنی مسلم کمیونٹی کی نچلی سطح کی کسان ذات سے تھا، لہٰذا میرا مارکسزم کے نظریے سے والہانہ لگاؤ ناقابلِ فہم نہیں ہونا چاہیے۔

واضح رہے کہ کمیونسٹ پارٹی سے میری تنظیمی وابستگی کا آغاز لاڑکانہ میں ہوا اور ۱۹۶۱ء سے ۱۹۷۲ء تک، یعنی قیام لاڑکانہ کے پورے عرصے میں لاڑکانہ ضلع کے پارٹی سکریٹری کے فرائضِ منصبی کی ادائیگی میری ذمہ داری تھی، سو سب سے پہلے اِس پارٹی اور اشتراکیت سے ہمدردی اور وابستگی رکھنے والے حضرات سے رابطہ کرنا میری اولین ترجیحات میں شامل تھا۔ اِس ضمن میں مرحوم عبدالرزاق شعور صدیقی میرے ہمدم و رفیقِ کار رہے۔ مرحوم سابقہ مشرقی پاکستان میں ریلوے کے محکمے سے وابستہ تھے اور ملازمت سے سبک دوشی کے بعد لاڑکانہ میں آباد ہو گئے تھے۔ اُن کی کمیونسٹ آئیڈیالوجی اور پارٹی سے وابستگی سابقہ مشرقی پاکستان میں قائم ہوگئی تھی۔ اُن کے چھوٹے بھائی مرحوم قیوم صدیقی، جو کراچی میں مقیم تھے، کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ تھے اور فعال کارکن تھے۔ اِس ضمن میں کامریڈ مولوی نذیر حُسین جتوئی سے میرا رابطہ قائم ہوا اور پہلی ہی ملاقات میں مَیں اُن سے متاثر ہوا، اُن کی شخصیت کی کثیر الجہتی سامنے آتی گئی۔ وہ باضابطہ عالمِ دین تھے اور دینی علوم کا اُنھوں نے گہرا مطالعہ کیا تھا۔ دین کی تفہیم میں وہ تقلید کے قائل نہیں تھے بلکہ اجتہادی رویے پر عامل تھے۔ وہ صورتاً مولانا آزاد سے بے حد مشابہت رکھتے تھے۔ اُن کے اوطاق میں آویزاں کامریڈ مولوی نذیر حُسین جتوئی کی تصویر مولانا آزاد سے اِس قدر مشابہت رکھتی تھی کہ آج بھی وہ تصویر

میری نگاہوں میں گھوم رہی ہے۔ کامریڈ جتوئی انڈین نیشنل کانگرس سے بھی وابستہ رہے تھے اور خلافت تحریک سے بھی، چنانچہ مولانا آزاد سے اُن کی ذہنی قربت قابلِ فہم تھی۔ وہ ایک کھرے اور سچے انسان تھے، یہ کھراپن اور سچائی اُن کی سیاسی زندگی میں وصفِ خاص کی حیثیت سے نمایاں تھی۔ وہ لگی لپٹی رکھنا نہیں جانتے تھے۔ وہ ہاری تحریک سے وابستہ ہوئے تو اُن کی اشتراکیت سے دلچسپی بڑھتی چلی گئی اور وہ اشتراکیت کے زبردست حامی بن گئے۔ کامریڈ نذیر حُسین جتوئی سے میرے رابطے اور ملاقاتیں ہوتی رہیں اور میں اُن سے بالیدگی حاصل کرتا رہا۔ وہ جہاں اشتراکی نصب العین کے حامی تھے، وہیں سندھی ثقافت کی عظیم روایات اور اقدار کے بھی دل دادہ تھے، اور سندھی ثقافت کی اقدار و روایات اُن کی زندگی کے معمولات میں شامل تھیں۔

یہاں ایک خوش گوار یاد ضبطِ تحریر میں لانا چاہتا ہوں۔ ہوا یہ تھا کہ میں نے اپنے چھوٹے بھائی محمد شہاب کی شادی کی تقریب میں اُنھیں مدعو کیا اور اُن کے گھر شادی کارڈ دے آیا تھا۔ وہ اُن دنوں لاڑکانہ سے باہر تھے، شادی کی تقریب میں بھی اُن کی شرکت نہیں ہوسکی تھی۔ کچھ عرصے بعد جب وہ لاڑکانہ سے آئے تو پہلی فرصت میں میرے گھر، جو حمل محلے لاڑکانہ میں واقع تھا، تشریف لائے اور تہنیتی کلمات کے ساتھ ایک لفافہ بھی پیش کیا۔ میں نے لفافہ قبول کرنے میں تکلف کرتے ہوئے کہا ''کامریڈ! اِس تکلف کی کیا ضرورت ہے'' تو اُنھوں نے مصنوعی خفگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا، ''تم پناہ گیر لوگ اِن ثقافتی روایات اور اقدار کی قدر کیا جانو!'' کامریڈ کا وہ پُرخلوص لہجہ اور اُن کے شگفتہ کلمات میں آج تک فراموش نہیں کرسکا۔

کامریڈ مولوی نذیر حُسین جتوئی کی شخصیت کے روشن پہلوؤں کی یادوں کے ساتھ ایک اور کثیر الجہت شخصیت کی یاد نوکِ قلم پر اتر آئی ہے۔ وہ شخصیت مرحوم کامریڈ تاج ابڑو کی ہے جو ایک معروف اور کامیاب وکیل ہونے کے ساتھ ایک بڑے مارکسی دانش ور

اور نظریہ داں بھی تھے۔ اُن کی ذاتی لائبریری میں تازہ ترین نظریاتی کتابیں ہوتیں اور وہ اُن کتابوں سے دوسروں کو استفادہ کرنے کا فراخ دلانہ موقع فراہم کرتے تھے مجھے بھی اُن کی اِس باب میں فیاضی سے فیض یاب ہونے کا فخر حاصل ہے۔ برطانوی مارکسی دانش ور اور مفکر MAURIS CORNFORTH کی تین جلدوں پر مشتمل مارکسزم پر کتابیں اُنھوں نے مجھے عنایت کی تھیں جو میں نے بڑی توجہ سے پڑھی تھیں، اور آج بھی میری رائے ہے کہ مارکسزم پر اُن سے بہتر کتابیں میرے زیرِ مطالعہ اب تک نہیں آئی ہیں کامریڈ تاج ابڑو بڑے نفیس اور سندھی تہذیب و ثقافت کا مثالی نمونہ تھے۔ مرحوم جمال ابڑو کے بڑے بھائی شمس الدین ابڑو کا وکالت کا دفتر اوطاق کے طور پر تاج ابڑو کے زیرِ تصرف تھا جہاں ہر روز کچہری ہوتی تھی۔ سندھی ثقافت میں کچہری کی بڑی سماجی افادیت ہے۔ میں اکثر اُس کچہری میں شریک ہوتا تھا۔ کامریڈ تاج ابڑو ایک COMMITTED مارکسسٹ اور وسیع مطالعہ رکھنے والے مارکسی دانش ور تھے۔ اُنھوں نے آمرانہ جبر واستبداد کے ایوبی دور میں بھی ایک تنظیم فری تھنکر زفورم (FREE THINKERS' FORUM) بنائی ہوئی تھی جس کے رسمی اجلاس ہر ہفتے اُن کے اوطاق میں منعقد ہوتے اور میں اُن اجلاسوں میں اُن کے معاونِ خصوصی کے فرائض انجام دیتا تھا۔ اُن اجلاسوں میں شہر کے متعدد صاحبانِ فکر شریک ہوا کرتے تھے جن میں سے دو نام مجھے اِس وقت یاد آگئے ہیں، نیشنل عوامی پارٹی کے صدر مرحوم دوست محمد ابڑو ایڈوکیٹ اور پروفیسر ڈاکٹر ایاز قادری۔ کامریڈ تاج ابڑو کے یہاں منعقدہ فکری اور نظریاتی اجلاسوں کی اہمیت اور افادیت کے سبھی احباب قائل تھے۔ اِس کے علاوہ ایک مقام ایسا ہے جس کا ذکر یہاں ناگزیر ہے اور وہ حاجی پیرزادہ کی ٹیلرنگ شاپ تھی جو لاڑکانہ کی معروف ترین گزرگاہ بندر روڈ پر واقع تھی۔ خود مرحوم حاجی پیرزادہ نیشنل عوامی پارٹی سے وابستہ تھے اور اُن کے شہر کے تمام کامریڈوں سے قریبی روابط تھے اور اُن کی دُکان کی حیثیت تمام

بائیں بازو کے عمائدین کی بیٹھک یا اوطاق کی سی تھی جہاں کامریڈ حیدر بخش جتوئی کامریڈ مولوی نذیرحُسین جتوئی، کامریڈ جمال الدین بخاری وغیرہ اکثر جمع ہوا کرتے تھے اور گھنٹوں کچہری ہوتی تھی جس میں مَیں بھی کبھی کبھی شریک ہوا کرتا تھا۔ میرے علم میں یہ بات نہیں ہے کہ کامریڈ نذیرحُسین جتوئی نے کوئی تحریری سرمایہ چھوڑا ہو اور یہی بات کامریڈ تاج ابڑو کے حوالے سے بھی کہی جاسکتی ہے۔ اِس ضمن میں ایک شخصیت کا نام قابلِ توجہ ہے، وہ جناب عبدالرزاق سومرو کی شخصیت ہے۔ اُن کی بائیں بازو کی سیاست سے شروع سے وابستگی رہی تھی اور وہ پیپلز پارٹی میں بے حد فعال رہے۔ اُنھوں نے اپنی سوانح عمری لکھ کر ایک بڑا کام کیا ہے۔ مجھے فخر ہے کہ اُنھیں اِس طرف متوجہ کرنے میں میرا کلیدی کردار رہا ہے اور میرا لکھا ہوا مہاگ، یعنی پیش لفظ شاملِ کتاب ہے۔

کامریڈ مولوی نذیرحُسین جتوئی ۳۰ رجولائی ۱۹۰۳ء مطابق ۵ رجمادی الاول ۱۳۲۱ھ بروز ہفتہ 'شاہ پور' نامی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ یہ گاؤں آج کل شکارپور ضلع میں ہے۔

> ''مولوی صاحب کے والدِ بزرگوار مولوی خادم حُسین جتوئی اپنے وقت کے نامور مدرس اور عالمِ دین تھے۔ مولوی نذیرحُسین جتوئی ابتدائی فارسی تعلیم اپنے والد سے حاصل کرنے کے بعد گھوٹکی میں مولانا امید علی کے پاس چلے گئے۔ بعد میں اُنھیں وگن ضلع لاڑکانہ (موجودہ ضلع قنبر شہدادکوٹ) میں مولوی محمد عظیم شیوا سولنگی کے پاس بھیجا گیا جو اُن کے والد کے شاگردِ رشید تھے''۔ (''لاڑکانو ساہ سیبانو''، ص ۲۴۱)

کامریڈ مولوی نذیرحُسین جتوئی کی دستار بندی رتوڈیرو میں ہوئی۔

''مولوی صاحب نے ۶، ۷ اور ۸ رجون ۱۹۲۰ء کو لاڑکانہ میں
ہونے والی خلافت کانفرنس میں اپنے والد مولوی خادم حُسین جتوئی
کے ساتھ شرکت کی۔ اِس کانفرنس میں رئیس المہاجرین جان محمد جونیجو
مولانا شوکت علی، مولانا عبدالجبار لکھنوی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو
مولانا محمد علی جوہر، مہاتما گاندھی، مولانا ابوالکلام آزاد، رئیس غلام محمد بھرگڑی
جی۔ایم۔سید، مولانا تاج محمود امروٹی، عبداللہ ہارون اور دیگر کئی رہ نما
شریک ہوئے تھے''۔ (رسالہ'مہران'،سوانح نمبر،ص ۲۸۵-۱۹۹۰)

۱۹۳۵ء میں نافذ ہونے والے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت ہونے والے بلدیاتی انتخابات میں کامریڈ نذیر حُسین جتوئی رتوڈیرو میونسپل کمیٹی کے رکن منتخب ہوئے اور اِسی سال اُنھوں نے 'انڈین نیشنل کانگرس' کی رکنیت بھی اختیار کی، 'جمعیتِ علمائے ہند' کے بھی وہ رکن رہے اور 'سامراج دشمن تحریک' میں ہراول دستے کے کارکن کی حیثیت سے بھی پہچانے جاتے تھے۔

۱۹۴۲ء میں لاڑکانہ شہر کے عظیم شاہ بخاری میدان میں مولوی محمد عظیم شیدا سولنگی نے جلسہ منعقد کر کے ہاری تحریک کو منظّم کرنے کا کام شروع کیا اور 'سندھ ہاری کمیٹی' ضلع لاڑکانہ کی ضلعی جمعیت بھی منتخب کی گئی جس میں مولوی محمد عظیم شیدا سولنگی ضلعی ہاری کمیٹی کے صدر اور کامریڈ نذیر حُسین جتوئی جنرل سکریٹری چنے گئے۔ آگے چل کر وہ 'سندھ ہاری کمیٹی' کے مرکزی نائب صدر بھی منتخب ہوئے اور متعدد بار مرکزی مجلسِ عاملہ کے رکن بھی رہے۔ سندھ میں 'نیشنل عوامی پارٹی' کی داغ بیل پڑی تو کامریڈ نذیر جتوئی بھی اُس میں شامل ہو گئے۔ اُنھوں نے 'آدھی بٹائی' تحریک میں جیل بھی کاٹی اور جیل

ہی میں شاعری کا آغاز کیا۔ اُنھوں نے تخلص 'جلالی' اختیار کیا۔
نمونۂ کلام:

لال پرچم اٹھا ہاتھ میں اور وطن کو لال کر
دکھائی دے جو غدار اپنی قوم کا ، اُس کو پامال کر
ملک کے مزدور، ہاری کی کر بھلائی، اُس کا بہتر حال کر
ملک کو مسرور کر ، غریب کو مالا مال کر

(ترجمہ: خالد چانڈیو)

کامریڈ مولوی نذیر حُسین جتوئی کی شاعری میں کسانوں اور مزدوروں کے حقوق کا پرچار، جاگیرداری، سرمایہ داری اور ملائیت کی بھرپور مذمت، انسانیت کے نعرے اور سوشلسٹ انقلاب کی نوید بھی موجود ہے۔ مولوی نذیر حُسین جتوئی، مولانا عبیداللہ سندھی کے معتقد اور شاہ ولی اللہ کے مکتبۂ فکر سے تعلق رکھنے کے باعث سوشلسٹ نقطۂ نظر اور عالمی سامراج دشمن تحریک و ترقی پسندی کے نقیب تھے۔

کامریڈ نذیر حُسین جتوئی انتہائی بے ریا اور سچائی پسند انسان تھے۔ پورے سندھ کے ادبی و سیاسی حلقوں میں بلکہ عوامی سطح پر بھی اُن کی بذلہ سنجی اور نکتہ دانیاں مشہور تھیں بات اُن کی زبان سے نکلتے ہی زبان زدِ خاص و عام ہو جاتی تھی۔ کامریڈ مولوی نذیر انتہائی حاضر جواب تھے۔ اُن کا انتقال ۲۳ مئی ۱۹۷۴ء کو لاڑکانہ شہر میں ہوا۔

اُن کی شخصیت کا روشن ترین پہلو اُن کی صاف گوئی اور حق گوئی تھی۔ وہ توہم پرستی اور پیر پرستی کے سخت خلاف تھے، اور مذہبی حلقوں میں اُن کی دھاک ایسی تھی کہ اُن کے سامنے لب کشائی کی کوئی جسارت نہیں کرتا تھا، اِس کا سبب اُن کی علمی ثروت مندی

تھی۔ اُن کا قرآن و حدیث کا اِتنا گہرا مطالعہ تھا کہ عام مولوی اور عالمِ دین اُن سے مکالمے کی جرأت نہیں کرتا تھا، اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ ایک سیکولر عالم اور دانش ور تھے۔ کامریڈ نذیر حُسین جتوئی پاکستان کو ایک جمہوری سیکولر ریاست کے طور پر دیکھنے کے قائل تھے اور اِس تناظر میں ہر اُس حکومت کے خلاف رہے جو آمریت کی راہ پر گام زن رہی۔ وہ پاکستان پیپلز پارٹی سے کبھی وابستہ نہیں ہوئے، ہرچند کہ 'روٹی کپڑا اور مکان' کا نعرہ اُن کو بھلا لگتا تھا۔ وہ اِس نعرے کو محض ایک سیاسی نعرہ اور عوام کو افیون کی گولی کھلانے کے مترادف سمجھتے تھے۔ وہ یہاں کے دیرینہ سیاسی قائدین خان بہادر محمد ایوب کھوڑو اور قاضی فضل اللہ کی سیاست کو عوام کے حق سے متصادم جانتے تھے اور اُن کے سخت نکتہ چیں رہے اور کبھی اُن کے حامیوں میں شامل نہیں رہے۔ وہ انسان دوست اور عوام دوست سیاست کے پرچارک تھے۔

# کامریڈ سوبھوگیان چندانی

۱۹۲۰ء - ۲۰۱۴ء

کامریڈ سوبھوگیان چندانی کی شخصیت کثیرالجہتی اور جامعیت کی حامل ہے۔ وہ ایک عظیم مارکسی نظریہ داں، مفکر، انقلابی دانش ور، ادیب و تخلیق کار، سیاست داں اور سیاست کار تھے۔ اِن اوصاف کے باوصف وہ سندھ کے عظیم انسانوں کی فہرست میں شامل ایک نمایاں نام ہیں۔ جناب سوبھوگیان چندانی کو ۲۰۰۴ء کے لیے اکادمی ادبیاتِ پاکستان کی طرف سے 'کمالِ فن' کا انعام دیا گیا۔ اکادمی ادبیاتِ پاکستان کے پریس ریلیز میں کہا گیا کہ سندھ کے نامور ادیب سوبھوگیان چندانی کو اکادمی ادبیات کی طرف سے تخلیقی وادبی خدمات کے اعتراف میں 'کمالِ فن' کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ اِس بات کا فیصلہ پاکستان کے معتبر و مستند اہلِ دانش پر مشتمل منصفین کے پینل ڈاکٹر فرمان فتح پوری مظہرالحق صدیقی، شفقت تنویر مرزا، ڈاکٹر انوار احمد، ڈاکٹر شاہ محمد مری، ڈاکٹر سلمیٰ شاہین پروفیسر خالدہ حسین، پروفیسر عالمگیر ہاشمی نے اکادمی ادبیاتِ پاکستان میں منعقدہ اجلاس

میں کیا۔ اجلاس کی صدارت ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے کی۔ 'کمالِ فن' ایوارڈ عمر بھر کی تخلیقی خدمات پر دیا جانے والا ملک کا سب سے بڑا ادبی ایوارڈ ہے جس کے انعام کی رقم پانچ لاکھ روپے ہے۔ اِس سے پہلے یہ انعام احمد ندیم قاسمی (۱۹۹۷ء)، انتظار حسین (۱۹۹۸ء)، مشتاق احمد یوسفی (۱۹۹۹ء)، احمد فراز (۲۰۰۰ء)، شوکت صدیقی (۲۰۰۱ء) منیر نیازی (۲۰۰۲ء) اور ادا جعفری (۲۰۰۳ء) کو دیا جا چکا ہے۔

جناب سوبھوگیان چندانی کو 'کمالِ فن' ایوارڈ دیے جانے کے اعلان کو ملک کے ادبی حلقوں میں بالعموم اور سندھ کے ادبی، سماجی، سیاسی اور ثقافتی حلقوں میں بالخصوص بڑی گرم جوشی کے ساتھ سراہا گیا۔ مذکورہ ایوارڈ کے اعلان کے فوری ردِعمل کی صورت میں ملک کے معروف ادیبوں اور شاعروں، جن کا تعلق مختلف زبانوں اور صوبوں سے ہے، کے ایک مشترکہ بیان میں کہا گیا کہ اکادمی ادبیاتِ پاکستان نے اِس سال 'کمالِ فن' ایوارڈ کے دائرے کو اردو کے ساتھ دوسری پاکستانی زبانوں تک وسیع کیا ہے جو ایک انتہائی خوش آیند اور قابلِ تحسین اقدام ہے، کیونکہ اِس طرح قومی یک جہتی اور پاکستانی ادبیات کے تصور کو فروغ اور قومی جذبے کو استحکام حاصل ہوگا اور یوں پاکستان کی سب زبانوں میں لکھنے والوں کو یکساں اہمیت اور مواقع حاصل ہوں گے۔ اِس ضمن میں یہ امر بھی باعثِ مسرت و تحسین ہے کہ 'کمالِ فن' ایوارڈ کے منصفین نے اِس سال سندھی ادب کی ایک اہم اور نمایندہ شخصیت کا انتخاب کیا جو اِس بات کا اعتراف بھی ہے کہ پاکستانی ادبیات میں سندھی زبان و ادب کا حصہ غیر معمولی طور پر نمایاں ہے منصفین نے ۲۰۰۴ء کا 'کمالِ فن' ایوارڈ سوبھوگیان چندانی کو دیا جو سندھی زبان و ادب اور ثقافتی خدمات کے حوالے سے خصوصی شہرت کے حامل ہیں۔ اُن کی پوری زندگی آزادیِ اظہار، سماجی انصاف، جمہوری اقدار اور روشن خیالی کی جد و جہد سے

عبارت ہے۔ وہ ابتدا ہی سے سندھی ادب کی ترقی پسند اور عوام دوست تحریکوں کے سرگرم اور فعال نمایندوں میں شامل رہے ہیں اور اُنھوں نے ادبی اور فکری سطح پر کئی نسلوں کی آبیاری کی ہے۔ مذکورہ مشترکہ بیان میں اِن خیالات کا اظہار اردو اور سندھی کے جن ادیبوں اور شاعروں نے کیا، اُن میں پروفیسر سحؔر انصاری، آغا سلیم، شمشیر الحیدری تاج بلوچ، مسلم شمیؔم، حسین انجؔم، سلیم یزدانی، مبیؔن مرزا، رضی مجتبیٰ، صبؔا اکرام، رؤف پاریکھ حسن عابدی، قمر شہباز، فاطمہ حسؔن، پروفیسر ایاز گل، ڈاکٹر ادل سومرو، ڈاکٹر ساغر ابڑو منظور کوہیار، عنایت میمن، عبدالوہاب سہتو، خالد چانڈیو، پروین سومرو، عنبرین حسیب عنبؔر شامل ہیں۔

میرے نزدیک جناب سوبھو گیان چندانی کو ’کمالِ فن‘، یعنی LIFETIME ACHIE-VEMENT AWARD دیا جانا ایک تاریخی واقعہ ہے، کیونکہ جناب سوبھو گیان چندانی برِصغیر کے ایک نہایت ممتاز اور معروف مارکسی دانش ور، نظریہ داں اور انقلابی شخصیت ہیں۔ پاکستان کی ابتدائی دو دہائیوں میں سوبھو صاحب کا نام لینا اپنے لیے ریاستی تادیبی کارروائیوں کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ اُن سے ملنا اور اُن سے استفادہ کرنا تو گویا قید و بند کی صعوبتوں سے خود کو دوچار کرنا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ۱۹۶۱ء سے جب وہ لاڑکانہ شہر سے تقریباً ۱۲ میل دور واقع گاؤں بندی میں نظربند تھے تو میں باہر سے آنے والے کمیونسٹ رہ نماؤں سے اُن کے لیے رابطے کا کام کرتا تھا ۱۹۶۰ء کے عشرے میں متعدد بار مجھے اُن کے گاؤں کی یاترا کرنی پڑی، سو میں جیپ کی سواری کے ساتھ بارہ بجے شب اُن سے ملنے اور ملانے کے لیے اُن کے گاؤں جاتا اور نمازِ صبح کی اذان سے پہلے وہاں سے واپس ہو جاتا۔ یہ وہ عرصۂ شب تھا جب فرائضِ منصبی انجام دینے والے سرکاری اہل کار محوِخواب ہوا کرتے تھے، اور یوں ہم نے

کسی خطرے سے دوچار ہوئے بغیر رابطے کی ذمہ داری پوری کی۔ سو' کمالِ فن' ایوارڈ کے اعلان نے بڑی دیر تک مجھے تاریخ کے اِس حصے میں محوِ خیال رکھا اور میں سوچتا رہا کہ تاریخ کے سفر کو کارل مارکس نے پیش رفت کا سفر قرار دیا تھا، اُس کی سچائی تجربے کا حصہ ثابت ہوئی۔ سوبھو گیان چندانی اپنی فکر اور اپنے نظریے کے حوالے سے جس طرح ۱۹۴۰ء کی دہائی سے جانے اور پہچانے جاتے رہے ہیں، اُسی طرح آج بھی اُن کا سب سے بڑا حوالہ اُن کا نظریاتی سفر ہے، اور نظریاتی سفر مارکسی نظریے کی سچائی کے فروغ اور ترویج میں زندگی گزارنے اور جد و جہد میں مصروف رہنے کا سفر ہے اُنھوں نے نظریاتی زندگی میں کوئی گھڑی ایسی نہیں آنے دی جس میں وہ کسی تشکیک کے مرحلے سے دوچار ہوئے یا کبھی اُن کے ذہن میں مسائلِ زیست کے دباؤ میں COMPROMISE کا خیال گزرا ہو۔ اِس طرح میں یہ لکھنے میں حق بجانب ہوں کہ وقت کے سامنے یعنی ESTABLISHMENT کے سامنے اُنھوں نے اپنا سر خم نہیں کیا ہے، بلکہ وقت یعنی ESTABLISHMENT نے اُن کے سامنے اپنا سر جھکایا ہے۔ اُن کی عظمت جو اُن کی عملی زندگی اور انقلابی جد و جہد کے نتیجے میں اُنھیں حاصل ہوئی ہے، اُس کے اعتراف کا آغاز ہوا ہے۔

جناب سوبھو گیان چندانی کی شخصیت کی بہت سی جہتیں اور پہلو ہیں اور ہر جہت اور پہلو یکساں روشن اور قابلِ تحسین و تقلید ہے۔ اُن کی خدمات اور کارناموں کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے برِصغیرِ ہند و پاک کی گزشتہ آٹھ دہائیوں کی تاریخ پیشِ نظر رکھنا ہوگی، اُس عہد میں ہونے والے واقعات اور تبدیلیوں کو سامنے رکھنا ہوگا۔ سوبھو صاحب کی سیاسی، سماجی اور ثقافتی زندگی کا آغاز ۱۹۴۰ء کی دہائی کے ابتدائی سالوں سے ہوتا ہے۔ اُنھوں نے شانتی نکیتن یونیورسٹی میں اپنی تعلیمی

زندگی کی تکمیل کی اور اپنے شعور کو پروان چڑھایا۔ کمیونسٹ پارٹی سے وابستگی سے پہلے وہ سندھ کی متعدد سماجی، ثقافتی اور تہذیبی تحریکوں سے وابستہ ہوئے بلکہ اُن کی رہنمائی اور قیادت کی۔ وہ غیر منقسم ہندوستان میں جاری آزادی کی تحریک سے وابستہ ہوئے اور پُرجوش کارکن کی حیثیت اُس میں شریک ہوگئے اور جلد ہی ممتاز اور نمایاں حیثیت حاصل کر لی۔ سندھ کی ہاری تحریک سے بھی وہ وابستہ ہوئے اور اُس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ سندھی ادب کی ترقی پسند تحریک سے وہ شروع سے وابستہ رہے اور تخلیقی و تنظیمی ہر دو اعتبار سے مثالی کارنامے انجام دیے۔

سوبھو صاحب، جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں، میری اُن سے عقیدت اور رابطوں کا عرصہ خاصا طویل ہے۔ لاڑکانہ کے دورانِ قیام (۱۹۶۰ء۔۱۹۷۲ء) میں میرا اُن سے قریبی رابطہ رہا اور ۱۹۷۲ء کے بعد سے آج تک یہ سلسلہ قائم ہے۔ سیکڑوں بار اُن کے خزینۂ علم سے استفادہ کرنے کے مواقع ملے۔ اُن سے ملاقات کرنا گویا ایک دبستانِ فکر سے ملاقات کرنا ہوتا ہے۔ کسی موضوع پر اُن سے کوئی سوال کیجیے اور پھر گھنٹوں اُن کی عالمانہ گفتگو سنتے رہیے۔ وہ دورانِ گفتگو میں سیکڑوں کتابوں کا حوالہ دیں گے، اُس موضوع کا جس عہد سے تعلق ہوگا اُس عہد کی تاریخ کے تمام گوشے کھول کر رکھ دیں گے۔ وہ میرے نزدیک LIVING AND MOVING ENECYCLOPEDIA کا درجہ رکھتے ہیں۔ سوبھو صاحب کو سندھ کا سقراط بھی کہا جاتا ہے۔ اُنھوں نے سندھ کی نئی نسلوں کو متاثر کیا ہے اور اُن کے لیے عام حلقوں میں بڑا احترام اور عقیدت پایا جاتا ہے۔ سقراط سے اُن کی مماثلت اِس اعتبار سے بھی ہے کہ سقراط نے تحریری طور پر غالباً کچھ ورثہ نہیں چھوڑا، مگر اپنے عہد میں بھی اُن کی فکر اور اُن کے نظریات کے اثرات معاشرے میں اِس نوعیت کے اور اِس پیمانے پر تھے کہ اُن کو اربابِ حل وعقد

نے اپنے لیے سنگین خطرہ جان کر اُن کو زہر کا پیالہ پیش کیا اور اِس طرح اُن کو موت کے حوالے کر دیا، مگر مردہ سقراط زندہ سقراط کی طرح جب سے آج تک انسانی شعور کے ارتقائی سفر میں رہ نمایانہ کردار ادا کر رہا ہے۔ سقراط کی فکر کو اُن کے عظیم شاگرد افلاطون نے اپنی کتابوں میں پیش کر کے اُنھیں زندۂ جاوید کر دیا۔ سوبھو صاحب کا تحریری ورثہ یقیناً بہت کم ہے، مگر یہ کہنا کہ اُنھوں نے سقراط کی طرح کوئی تحریری ورثہ نہیں چھوڑا، یہ غلط بات ہے۔ اِس ذیل میں سید مظہر جمیل نے مذکورہ کتاب 'سوبھو گیان چندانی شخصیت اور فن' کے پیش لفظ میں لکھا ہے:

"ہر چند تخلیقی سطح پر اُنھوں نے بہت کم افسانے لکھے ہیں، لیکن اُن کے افسانوں نے سندھی افسانہ نگاری میں سوشل ریئلزم کی روایت کو استحکام بخشنے میں تاریخی کردار ادا کیا ہے جس سے انکار ممکن نہیں افسوس ناک بات یہ ہے کہ سوبھو صاحب نے عدیم الفرصتی اور متنوع دلچسپیوں سے کہیں زیادہ اپنے استغنائی مزاج کے طفیل اپنی نثری تحریروں اور منظومات سے ناقابلِ تلافی اغماض برتا ہے جس کے نتیجے میں اچھا خاصا نثری ذخیرہ اور شاعری کا تمام سرمایہ تلف ہو چکا ہے، لیکن اِس کے باوجود اب بھی بے شمار مضامین، مقالات، شذرات، خاکے، اداریے انٹرویوز، لکچرز اور دیباچے مختلف رسائل و جرائد اور مخزنوں کے ملبے تلے دبے ہوئے ہیں۔ سوبھو صاحب کی منتشر تحریروں کو یک جا کر کے شائع کروایا جائے تو کم از کم دس کتابوں کا مواد دستیاب ہو سکتا ہے"۔

اُنھوں نے ۱۹۴۰ء کی دہائی میں رجحان ساز کہانیاں بھی لکھیں۔ 'تاریخ بولتی ہے' یہ اُن کے فکر انگیز مضامین اور کالم کا بڑا اہم مجموعہ ہے جس میں بیسویں صدی کی تاریخ

کے اہم ترین گوشے روشن ہیں۔

یہ بات سب کو معلوم ہے کہ وہ اپنے نظریات اور اپنی نظریاتی زندگی کے حوالے سے کبھی متزلزل نہیں ہوئے اور نہ اُنھوں نے کبھی COMPROMISE کرنے کی بات سوچی۔ ایک عرصۂ دراز کے قید و بند سے آزاد ہوئے تو میر غوث بخش بزنجو نے اُنھیں کوئٹہ بلایا جب وہ وہاں کے گورنر تھے اور اُن کی ملاقات اسلام آباد میں مرحوم ذوالفقار علی بھٹو سے کرائی۔ اِس ملاقات کا دلچسپ منظرنامہ اُنھوں نے بیان کیا تھا جس کے ذریعے یہ قیاس کرنا مشکل نہ تھا کہ قصرِ صدارت یا ایوانِ وزیرِ اعظم میں شہید بھٹو MILITARY ESTABLISHMENT کے زیرِ نگرانی تھے اور اُن کا کمرا بھی BUGGED تھا اور بھٹو صاحب اِس سے باخبر بھی تھے، چنانچہ سوبھو صاحب بھٹو صاحب سے جو کچھ کہتے رہے، بھٹو صاحب نے اُس کا کوئی جواب نہیں دیا بلکہ کمرے کی چھت کو دیکھتے رہے اور الوداعی کلمات یہ کہے کہ سوبھو صاحب پیپلز پارٹی کے لیے کام کریں جو ظاہر ہے سوبھو صاحب کے لیے کیا معنی رکھتا تھا۔

سوبھو صاحب کی زندگی میں کمیونسٹ پارٹی سے وابستگی جو ۱۹۴۰ء کی دہائی سے شروع ہوئی تھی، اُس کی اہمیت اور قدر و قیمت کبھی کم نہیں ہوئی۔ وہ کبھی کسی گروپ کی نظر میں CONTROVERSIAL نہیں رہے۔ ہر گروپ اور FACTION اُن سے ملتا رہا ہے اور اُن کی آشیرباد حاصل کرتا رہا ہے، سبھی اُن کا احترام کرتے ہیں۔ سندھ کی ترقی پسند تحریک کے وہ ۱۹۴۰ء کی دہائی سے رہ نمائی کرتے آئے ہیں۔ 'سندھی ادبی سنگت' (۱۹۴۵۔۴۶ء) کے قیام سے پہلے ترقی پسند تحریک کی صدائے بازگشت سندھی ادب و شعر میں سنائی دینے لگی جس کے روحِ رواں سوبھو صاحب تھے مجھے ۱۹۸۶ء کی PWA گولڈن جوبلی کے چار روزہ اجلاسوں میں اُن کی موجودگی اور

سرگرمی سے اُن میں حصہ لینا اچھی طرح یاد ہے۔ وہ STEERING COMMITTEE اور SUBJECT COMMITTEE کے رکن تھے اور اُن کا کلیدی کردار رہا تھا۔ اختتامی اجلاس جو BUSINESS SESSION تھا، جس میں اعلان نامہ اور قراردادیں منظور ہونا تھیں، ایک مرحلے پر اُس میں خاصا CONFUSION بلکہ DISPUTE کھڑا ہوگیا۔ اُس وقت میں نے ایجنڈے سے ہٹ کر سوبھو صاحب کو مائک پر اجلاس سے خطاب کی دعوت دی جس کا اُنھیں پہلے سے کوئی علم نہیں تھا۔ بہرحال اُنھوں نے میری درخواست بڑی فراخ دلی سے قبول کی اور صورتِ حال کو پیشِ نظر رکھ کر اُنھوں نے جو تقریر کی، اُس کے نتیجے میں CONFUSION اور DISPUTE کی جگہ CONCENSUS پیدا ہوگیا۔ دراصل جب وہ مائک پر آئے تو ہال کی فضا ہی تبدیل ہوگئی اور اُن کا اِس گرم جوشی سے استقبال ہوا کہ جیسے کسی LEGENDARY PERSONALITY کی پذیرائی ہوتی ہے۔

سوبھو صاحب کی عمر خاصی ہوگئی ہے اور اب وہ ۹۰ کے پیٹے میں ہیں۔ گزشتہ کئی برسوں سے اُن کی صحت بری طرح متاثر ہے، خاص طور پر اپنے بے حد عزیز بیٹے ڈاکٹر کنہیا کی موت کے نتیجے میں وہ گویا ٹوٹ سے گئے ہیں۔ ویسے ڈاکٹر کنہیا کی طویل پیچیدہ بیماری نے ایک عرصے سے اُنھیں بھی بیمار کررکھا تھا۔ اُنھوں نے اپنے بیٹے کے علاج کے لیے اپنی قیمتی لائبریری آٹھ یا دس لاکھ روپے میں بیچ دی تھی جس کا اُنھیں ملال ہے۔ جسمانی صحت کے ساتھ اُن کا حافظہ بھی متاثر ہوا ہے، اور گفتگو کرتے وقت وہ سلسلۂ کلام قائم نہیں رکھ پاتے۔ اِس کے باوجود اب بھی اُن کے پاس بیٹھ کر علم و شعور کے خزانے سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

سوبھو صاحب سے بہت سے لوگوں نے بڑے بڑے انٹرویو ریکارڈ کروائے ہیں ایک طویل انٹرویو ڈاکٹر شاہ محمد مری نے ایک کتابچے کی صورت میں شائع کیا تھا جس کا

نام 'موئن جو دڑو کا جوگی' ہے۔ واضح رہے کہ 'موئن جو دڑو کا جوگی' کے نام سے سوبھو صاحب کو شانتی نکیتن میں رابندر ناتھ ٹیگور پکارتے تھے۔ سندھی ادب اور ترقی پسند تحریک کے حوالے سے اُن کا ایک طویل انٹرویو سید مظہر جمیل اور میں نے لیا تھا جو ۱۹۸۶ء میں PWA کی مذکورہ گولڈن جوبلی کے موقع پر شائع ہونے والی کتاب 'گفتگو' میں شامل ہے جو سوبھو صاحب کو بہت پسند ہے اور جس کا ترجمہ سندھی میں بھی شائع ہو چکا ہے۔

اکادمی ادبیاتِ پاکستان نے، جیسا کہ بیان ہو چکا ہے، کامریڈ سوبھو گیان چندانی کو ۲۰۰۴ء کا 'کمالِ فن' ایوارڈ دیا تھا، اکادمی نے 'پاکستانی ادب کے معمار' کے سلسلے کے تحت 'سوبھو گیان چندانی۔شخصیت اور فن' کے نام سے ایک جامع کتاب شائع کی جو سید مظہر جمیل کا ایک تحقیقی اور تنقیدی کارنامہ ہے۔ سید مظہر جمیل ایک غیر معمولی بصیرت و بصارت رکھنے والے اور صاحبِ مطالعہ قلم کار ہیں۔ اُن کا سب سے بڑا کارنامہ 'جدید سندھی ادب' پر وہ قاموسی کتاب ہے جس کے حوالے سے اُنھیں بھی مذکورہ اکادمی نے اعزاز بخشا۔ سجاد ظہیر کے حوالے سے اُن کی کتاب 'انگارے سے پگھلا نیلم تک' ایک یادگار ادبی شاہکار ہے۔ 'آشوبِ سندھ اور اردو فکشن' افسانوں اور تنقید کے باب میں ایک نئے انداز اور اسلوب کی حامل عظیم تصنیف ہے۔ زیرِ نظر تحریر اور اظہار سید مظہر جمیل کی مذکورہ کتاب 'سوبھو گیان چندانی۔شخصیت اور فن' کا حاصلِ مطالعہ ہے۔

جناب سوبھو گیان چندانی کا تعلق مردم خیز خطۂ اراضی لاڑکانہ سے ہے، یعنی لاڑکانہ اُن کا ایک بڑا حوالہ ہے، مگر جو بین الاقوامی شہرت اُنھیں حاصل ہوئی ہے اُس کے باوصف وہ خود لاڑکانہ کا ایک بڑا حوالہ بن گئے ہیں۔ سوبھو گیان چندانی صاحب کا اصل نام سوبھراج ہے، لیکن وہ کامریڈ سوبھو گیان چندانی کے نام سے جانے

پہچانے جاتے ہیں۔ وہ ۳ مئی ۱۹۲۰ء کو گوٹھ بندی میں پیدا ہوئے تھے۔ گوٹھ بندی موئن جو دڑو یعنی وادیِ سندھ کی عظیم تہذیب کے گہوارے سے پانچ کلومیٹر شمال کی جانب ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جو صدیوں سے آباد چلا آرہا ہے۔ پچاس ساٹھ گھروں پر مشتمل یہ سندھ کے قدیم ترین دیہاتوں میں سے ایک ہے جو دریائے سندھ کے کنارے سرسبز منظر کے ساتھ واقع ہے۔ جنوب میں ڈوکری شہر سے اِس کا فاصلہ تقریباً بیس کلومیٹر ہوگا۔ یہ بستی انگنت بستیوں کی طرح ایک غیر معروف بستی تھی جہاں سائیں سوبھوگیان چندانی نے اب سے اٹھاسی سال قبل ۳ مئی ۱۹۲۰ء کو جنم لیا تھا۔ اِس چھوٹے سے گم نام گاؤں کو جغرافیے کے نقشے پر ڈھونڈنا تو سعیِ لاحاصل ہوگا لیکن گزشتہ چھ دہائیوں میں کامریڈ سوبھو کی نسبت سے اِسے سندھ کی علمی، ادبی، سیاسی اور سماجی زندگی میں جو غیر معمولی شہرت اور اعتبار حاصل ہوا ہے، وہ نسبت اب اِس گاؤں کی شناخت بن گئی ہے۔

کامریڈ سوبھوگیان چندانی کا خاندان سِکھ مت کے بانی گرونانک کا ماننے والا ہے اور یہ لوگ نانک پنتھی کہلاتے ہیں، لیکن سِکھ مت کے عقائد کے مطابق نہ تو یہ ڈاڑھی رکھنے کے پابند ہیں اور نہ کرپان، کڑا اور کیس وغیرہ کو اپنے عقیدے اور مسلک کے لوازم میں شمار کرتے ہیں، بلکہ اِن کے ہاں عام طور پر کم و بیش سبھی اہم مذاہب کی اخلاقی اقدار کی پاس داری اور بڑا احترام کرنے کا چلن پایا جاتا ہے۔ یہ حقیقت پیشِ نظر رہے کہ سندھ کے ہندوؤں میں اکثریت نانک پنتھی، وشنومت اور شیومت سے وابستہ تھی۔ اُن کے عقائد اور رسوم میں سادگی اور وسیع المشربی کے عناصر نمایاں رہے ہیں اُن کے درمیان برہمنوں کی عدمِ موجودگی نے بھی کٹر پنتھی رویوں کو پھولنے پھلنے سے باز رکھا ہے۔ یوں بھی سِکھ مذہب ہندوستان کا سب سے کم عمر اور جدید ترین مذہب

ہے، اس لیے اِس کے ماننے والوں میں انسان دوستی، فطرت پرستی، پیار محبت اور رواداری کے رجحانات اور رویوں کی عمل داری نسبتاً زیادہ نمایاں رہی ہے۔ کامریڈ سوبھو گیان چندانی کو انسان دوستی اور روشن خیالی ورثے میں ملی ہے جو آگے چل کر فلسفے اور نظریے کی صورت میں اُن کا آدرش ٹھہری اور وہ اُس آدرش کے ایک بڑے پرچارک بن کر اپنے سماج کو عقائد کے اندھیروں اور انتہاپسندی کی تاریکیوں سے نجات دلانے کی جدوجہد میں زندگی گزارتے آئے ہیں۔

کامریڈ سوبھو گیان چندانی کا سلسلۂ درس روایت کے مطابق اُن کے اپنے گھر سے شروع ہوا اور اُنھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے دادا پرتھ داس سے حاصل کی تھی جنھوں نے سندھی حروف تہجی، فارسی الف بے اور گورمکھی کی شد بد کم عمری ہی میں کروادی تھی، گرنتھ صاحب اور رامائن کے بعض منتخب اشلوک بھی ورد کروا دیے گئے تھے۔ پانچ سال کی عمر (۱۹۲۵ء) میں جب وہ بگھی نامی گاؤں کے گورنمنٹ پرائمری اسکول میں اپنے بڑے بھائی کیول رام کے ساتھ داخل کیے گئے تو اُنھیں بہت سی باتوں میں اپنے ہم سبقوں پر فوقیت حاصل تھی۔ یہ اسکول گاؤں بندی سے ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ پرائمری تعلیم کی تکمیل کے بعد اُنھیں اور اُن کے بڑے بھائی کیول رام کو لاڑکانہ ضلع کے تعلقے شہر قمبر کے اے۔ وی۔ ہائی اسکول میں (۱۹۲۹ء) میں داخل کروا دیا گیا تھا جو ماضیِ قریب سے نئے ضلع شہداد کوٹ کا صدر مقام ہے ابھی قمبر کے اسکول میں تعلیم کا سلسلہ جاری تھا کہ ہیڈ ماسٹر روچی رام شاہانی سبک دوش ہو گئے جو ایک شفیق اور ہر دل عزیز استاد تھے۔ اُن کی جگہ علی گڑھ یونیورسٹی کے تربیت یافتہ ایک ایسے استاد کا تقرر ہوا تھا جن کی سخت گیری کی شہرت اُن سے پہلے اسکول میں پہنچ گئی تھی، چنانچہ کامریڈ سوبھو کے بزرگوں نے قمبر ہائی اسکول

سے لاڑکانہ کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں اُن کا تبادلہ کروا لیا۔ قمبر کے اسکول سے اُنھوں نے انگریزی کی چوتھی جماعت تک تعلیم حاصل کی تھی۔ گورنمنٹ ہائی اسکول لاڑکانہ کے قیام کے دوران میں اُنھوں نے انگریزی کی استعداد خاصی مضبوط کر لی تھی۔ جب لاڑکانہ گورنمنٹ ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر کرم چند ہنگورانی کا تبادلہ لاڑکانہ سے این۔ جے۔ وی۔ ہائی اسکول کراچی ہوا تو وہ سوبھوگیان چندانی کو بھی اپنے ساتھ کراچی لے آئے۔ اُس زمانے میں این۔ جے۔ وی۔ ہائی اسکول کراچی ہی نہیں بلکہ پورے سندھ کی بہترین درس گاہ شمار ہوتا تھا جہاں بہترین صلاحیت رکھنے والے طلبا و طالبات تعلیم حاصل کرتے تھے۔ این۔ جے۔ وی۔ اسکول کراچی کا دور اُن کی زندگی کا سب سے اہم دور رہا ہے۔ اِس دور سے اُن کی شخصیت کی تعمیر اور نکھار کا آغاز ہوا اور اُن کی کردار سازی کی بنیاد پڑی۔ اُنھوں نے این۔ جے۔ وی اسکول کراچی سے ۱۹۳۷ء میں میٹرک اعزاز کے ساتھ پاس کیا تھا۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد جناب سوبھوگیان چندانی نے ڈی۔ جے۔ سندھ کالج کے شعبۂ فنون میں داخلہ لیا۔ انٹر پاس کرنے کے بعد ۱۹۳۹ء میں اُنھیں شانتی نیکتن میں داخلہ ملا۔ شانتی نیکتن سے کامریڈ سوبھوگیان چندانی کی وابستگی کا اُن کی شخصیت کے ارتقائی سفر میں کلیدی کردار ہے۔ اِس ضمن میں سید مظہر جمیل نے اپنی کتاب 'سوبھوگیان چندانی ۔شخصیت اور فن' کے پیش لفظ میں تحریر کیا ہے، اُس کا ایک اقتباس پیشِ خدمت ہے:

> "عالمی شہرت یافتہ درس گاہ شانتی نیکتن میں تکمیل کے دوران میں اُنھیں نوبل انعام یافتہ بنگالی زبان کے معروف شاعر، ڈراما نگار ناول نویس اور مفکر رابندر ناتھ ٹیگور سے بالمشافہہ ملتے رہنے اور اُس کے فکر و فن کے اسرار و رموز کو سمجھنے کے نادر مواقع حاصل ہوئے اور ٹیگور کی خصوصی توجہ کے تحت اُس کے کتب خانۂ خاص سے استفادے کی سعادت بھی

نصیب ہوئی۔ یہیں ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں شامل مختلف انقلابی رہ نماؤں سے روابط قائم ہوئے اور اِسی مادرِ علمی میں مختلف معاشی سیاسی، سماجی اور علمی نظریوں بالخصوص مارکسی فلسفے اور فکریات سے آگاہی حاصل ہوئی اور انسانی تہذیب کے جدلیاتی عمل کو بیسویں صدی کے عالمی تناظر میں سمجھنے کے مواقع بارآور ہوئے۔ بے شک شانتی نیکتن میں رہ کر سوبھو صاحب کے شعور و ادراک ،علم و آگہی ، جذبہ و احساس اور بصیرت و بصارت کے عملی تفاعل کے دائرے میں غیر معمولی وسعت،تنوع گہرائی پیدا ہوئی تھی ، اور اِس ضمن میں اُنھوں نے الوداعی تقریب (۱۹۴۰ء) میں سچ ہی کہا تھا، 'میں اِسی مادرِ علمی میں ایک رومانی ذہن رکھنے والے خام کارلڑکے کی حیثیت سے داخل ہوا تھا اور محض دوسال کی قلیل مدت میں ایک باشعور انقلابی نوجوان کی حیثیت سے واپس جا رہا ہوں' ''۔

شانتی نیکتن کے مذکورہ الوداعی جلسے میں کامریڈ سوبھو کے انگریزی کے استاد الیگزینڈر ایڈیسن نے اُن سے اظہارِ تحسین کرتے ہوئے کہا تھا:

''شانتی نیکتن کے ماضیِ قریب میں سوبھو جیسے ذہن اور حصولِ علم کی طلب رکھنے والے لوگ کم آئے ہیں، اور وہ اپنے دوسالہ دور کی بہت سی یادیں یہاں چھوڑے جا رہے ہیں۔ عام طور پر مخلوط تعلیمی اداروں میں لڑکے لڑکیوں کے تعاقب میں پھرتے ہیں اور اُن کی دلچسپیاں نصابی سرگرمیوں سے کہیں زیادہ غیر نصابی معاملات میں ہوتی ہیں، لیکن سوبھو نے اپنی دل کش شخصیت کے باوجود اپنے آپ کو اِن تمام کی سرگرمیوں سے

محفوظ رکھا، حالانکہ کئی لڑکیاں تھیں جو اُن کے پیچھے دیوانی ہوئی جاتی تھیں
مگر سوبھو نے جو تعلیمی ریکارڈ قائم کیا ہے اور آنرز میں جو مقالہ لکھا ہے
وہ کالج کے ریکارڈ میں محفوظ رہے گا، کیونکہ اُنھوں نے اِس مقالے کی
تیاری میں نصاب کی کتابوں سے کہیں زیادہ وسیع تر مطالعے کو استعمال
کیا ہے''۔

شانتی نیکتن کا عرصۂ قیام اور حصولِ علم کے ثمرات کا کامریڈ سوبھو گیان چندانی کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل اور اُن کے فکر و شعور کے ارتقائی سفر میں رہ نمایانہ کردار اور حصہ ٹھہرتا ہے۔ اُن کی ساری زندگی اور جد و جہد میں اِس ادارے کے نقوش ہر جگہ نمایاں ہیں۔ شانتی نیکتن کے قیام کے دوران میں سب سے اہم واقعہ کامریڈ سوبھو کا بنگال کے بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے انقلابیوں سے رابطہ تھا۔ وہ تعلیمی کیریر کے دوسرے سال کے ابتدائی دن تھے جب اُنھیں کسی اجنبی شخص کی جانب سے پیغام ملا کہ آپ سے چند بنگالی انقلابی دوست جو ہندوستان کی جنگِ آزادی میں پیش پیش ہیں، ملنے کے خواہش مند ہیں۔ اُن میں سب سے اہم نام پنا لال داس گپتا کا تھا۔ ایسا ہی ایک بلاوا ابکھن پور کے چند انقلابیوں کی طرف سے ملا ہوا تھا۔ وقت کے ساتھ اِس انقلابی گروپ سے اُن کی دوستی مستحکم ہوگئی اور اِن میں بعض لوگوں سے ذاتی تعلقات قائم ہوگئے جو تا عمر رہے۔ مذکورہ انقلابی لوگوں سے ملنے کے بعد سوبھو صاحب کے ذہن میں زندگی کا یہ رخ بھی واضح ہوگیا کہ آدرش وادی آدمی کیا ہوتا ہے اور اُس کو کس طرح قربانیاں دینا پڑتی ہیں۔ سو یہ سبق اُنھیں ہمیشہ یاد رہا اور اُنھوں نے ایک آدرش وادی آدمی کی زندگی گزارنے کا عزمِ صمیم کیا اور ساری عمر اُس آدرش کا عملی پیکر بنے رہے فیض احمد فیض کا یہ شعر یہاں برمحل یاد آ رہا ہے:

ایسے ناداں بھی نہ تھے جاں سے گزرنے والے
ناصحو! پند گرو! راہ گزر تو دیکھو

سوبھو صاحب آدرش وادیوں کی روایت اور سنت کی پیروی کرتے ہوئے زندگی کے مختلف ادوار میں قید و بند کے مراحل سے دوچار ہوئے اور سرخ رو گزرے کامریڈ سوبھو اِس وقت عمر کی اٹھائیس منزلیں طے کر چکے ہیں اور اپنی عمر کا ایک بہترین حصہ ''ضمیر کے قیدی'' کی حیثیت سے قید خانوں میں گزارا ہے۔ اُنھیں نظر بندیوں کے علاوہ چھ مرتبہ جیل یاترائی نصیب ہوئی اور سب کی سب اِس جرم میں کہ اُنھوں نے ہندوستان کی آزادی اور پاکستان کے قیام کی لگن میں مصروفِ کار قوتوں کا ساتھ دیا تھا اور معاشرے میں عوامی فلاح ، جمہوری قدروں اور اجتماعی خیر کی کوششوں کو بارآور کرنے میں کسی نہ کسی طور پر عملی حصہ لیا تھا۔ اُنھوں نے اپنے عہدِ اسیری کی افتاد کو بھی ایسے ہی حوصلے اور عزم کے ساتھ جھیلا ہے کہ قید خانوں میں گزرے ہوئے ہر لمحے کو اپنے آدرش کی توسیع اور عزم کے لیے استعمال کیا۔ عرصۂ قید و بند میں پیش آنے والے تجربات اور مشاہدات کی جھلکیاں اُن کی کہانیوں ، مضامین اور دیگر تحریروں میں نظر آتی ہیں۔ وہ قید و بند کی صعوبتوں سے نہ تو کہیں گریزاں رہے اور نہ مایوسی کا شکار ہوئے ، بلکہ بقولِ فیضؔ

ہر داغ ہے اِس دل میں بجز داغِ ندامت

کامریڈ سوبھو اپریل ۱۹۴۱ء میں شانتی نیکتن سے تعلیم مکمل کر کے کراچی واپس لوٹے اور اُس زندگی کی ابتدا کی جو ایک آدرش وادی اور انقلابی کی زندگی کے معیارات پر پوری اترتی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان بھر میں قومی آزادی کی تحریکیں چل

رہی تھیں۔ سوبھو ابھی ایس۔ ای۔ شاہانی لا کالج کراچی کے دوسرے سال میں تھے اور فائنل امتحانات کی تیاری شروع کی تھی کہ برطانوی حکومت کے خلاف 'ہندوستان چھوڑ دو' تحریک (QUIT INDIA MOVEMENT) شروع ہوگئی۔ اِس تحریک میں طلبا تنظیمیں بھی پوری طرح سرگرمِ عمل ہوچکی تھیں۔ سندھ میں سوبھو گیان چندانی اور اُن کے ساتھی تحریک میں پیش پیش تھے اور سندھ کے گوشے گوشے میں یہ تحریک چل رہی تھی جس کی قیادت کرنے والوں میں کامریڈ سوبھو کا نام سب سے نمایاں تھا۔ سندھ کے چھوٹے بڑے شہروں سے کم و بیش چار پانچ ہزار طالبِ علموں سے جیل بھر گئے تھے۔ کامریڈ سوبھو ۲۵ جنوری ۱۹۴۳ء کی صبح میٹھارام ہاسٹل کراچی کے ٹینس کورٹ میں تقریر کرتے ہوئے گرفتار ہوگئے۔ یہ کامریڈ سوبھو کی پہلی جیل یاترا تھی جو جولائی ۱۹۴۴ء تک جاری رہی ابھی کامریڈ سوبھو جیل ہی میں تھے کہ عالمی سیاست نے ایک نئی کروٹ لی اور نازی جرمنی نے سوشلسٹ روس پر حملہ کر دیا اور اِس طرح اُس کو جنگ میں ملوث کر دیا گیا جس کے نتیجے میں ساری دنیا کی کمیونسٹ پارٹیوں کے ساتھ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا نے اِس جنگ کو جسے کل تک وہ فسطائی جنگ قرار دیتے تھے، عوامی جنگ کا درجہ دے دیا اور جنگ کے اِس مرحلے میں برطانوی حکومت کے ساتھ تعاون کا فیصلہ ہوا۔ اِس فیصلے کے نتیجے میں ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹی اور اُس کی حلیف جماعتوں پر عائد پابندیاں ختم ہوگئیں اور بائیں بازو کے کارکنوں کو جیلوں سے رہائی حاصل ہوگئی۔ اِس فیصلے کے نتیجے میں فیض احمد فیضؔ اور دیگر ترقی پسند شعرا نے برطانوی فوج میں ملازمتیں قبول کیں۔ اُس وقت کامریڈ سوبھو جیل ہی میں تھے۔ اُنھیں کمیونسٹ پارٹی نے پیغام دیا کہ وہ طلبا تحریک کو فی الفور ختم کردیں اور جنگ کے حق میں بیان دے کر جیل سے باہر آجائیں، لیکن کامریڈ سوبھو نے فیصلے سے انحراف کیا اور جیل ہی میں رہنا گوارا کیا

کامریڈ سوبھو نے یہ انحراف کا فیصلہ اُن حالات میں کیا جب سندھ میں کم وبیش پانچ ہزار طلبا جیلوں میں بند تھے۔ وہ اپنے اُن ساتھیوں کی آزادی سے قبل خود جیل سے نکل آنے کو مجرمانہ فعل سمجھتے تھے۔ بالآخر جولائی ۱۹۴۴ء میں حکومت نے یک طرفہ طور پر طالبِ علموں کو آزاد کرنے کا فیصلہ کیا اور کامریڈ سوبھو بھی جیل سے رہا ہوگئے۔ بعد میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا نے اِس بات کو تسلیم کیا کہ کامریڈ سوبھو نے جیل سے رہائی کی خاطر طلبا تحریک کو ختم کرنے سے انکار کر کے طالبِ علموں میں بائیں بازو کے اثرات کو مزید مستحکم کیا۔ مذکورہ احوالِ واقعہ کی روشنی میں یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ کامریڈ سوبھو کی کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا سے وابستگی اُن کے شانتی نیکتن کے قیام کے دوران میں قائم ہوگئی تھی اور وہ وہاں سے لوٹ کر سندھ میں اِس پارٹی کے ایک فعال کارکن بنے اور بعد میں قیادت کے منصب پر فائز ہوئے۔

کامریڈ سوبھو گیان چندانی کا شمار جدید سندھی ادب کے اُن معماروں میں سرِفہرست ہوتا ہے جنھوں نے گزشتہ سات دہائیوں کے عرصے میں کئی نسلوں کو متاثر کیا ہے اور تربیت کا فریضہ انجام دیا ہے، خاص طور پر سندھی ادب اور سماج میں ترقی پسند تصورات، نظریات، خیالات اور رویوں کو مقبول بنانے کے سلسلے میں اُن کے کارہائے نمایاں کی کلیدی اہمیت تسلیم کی گئی ہے۔ 'آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن' میں اُن کی دلچسپی نے اُنھیں ہندوستان گیر شہرت بخشی تھی اور وہ ایک طالبِ علم رہ نما کی حیثیت سے معروف ہوگئے تھے۔ یہاں یہ بات بتانا معنویت سے خالی نہیں کہ 'آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن' کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی طلبا وِنگ یعنی ذیلی تنظیم تھی۔ سندھی معاشرے کی فرسودگی اور بدحالی تو اُن کے سامنے تھی لیکن شانتی نیکتن کے سفر نے اُنھیں ہندوستان کے دوسرے خطوں کی تاریک اور نیم تاریک تصویریں بھی دکھا دی

تھیں، اور وہ اِس بات کو اپنا مشن بنا چکے تھے کہ ہر باشعور اور تعلیم یافتہ فرد کو انسانوں کے درمیان بغیر کسی تخصیص و تفریق کے علم و شعور کی روشنی پھیلانے کے لیے مسلسل کام کرنا چاہیے، چنانچہ عملی زندگی کے آغاز ہی سے اُنھوں نے اِس مشن کو ہمیشہ اپنے پیشِ نگاہ رکھا۔ اُن کا یہ مشن ہر اُس شعبے میں اُن کا رہ نما رہا جہاں جہاں وہ فعال رہے۔ اُن کی علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیاں اِسی مشن کے دائرۂ کار میں رہیں۔ جب جولائی ۱۹۴۴ء میں وہ جیل سے باہر آئے تو ایک ہفتے کے اندر اندر ''سندھی ادبی سنگت'' کی داغ بیل ڈالی۔ واضح رہے کہ یہ تنظیم دراصل انجمنِ ترقی پسند مصنّفین کا نعم البدل تھی۔ یہاں یہ اظہار بھی بے محل نہیں ہے کہ انجمنِ ترقی پسند مصنّفین جو ۱۹۳۶ء میں قائم ہوئی تھی اُس کے محرکین سبھی کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا سے وابستہ تھے، اور یہ کہ انجمنِ ترقی پسند مصنّفین عالمی کمیونسٹ تحریک کے زیرِ اثر قائم ہوئی تھی۔ سندھ میں ''سندھی ادبی سنگت'' کے قیام اور تنظیم کو اِسی تناظر میں دیکھا جانا چاہیے۔ یہ بات بے محل نہیں کہ انجمنِ ترقی پسند مصنّفین کی طرح ''سندھی ادبی سنگت'' بھی وسیع تر بنیادوں پر قائم ہوئی تھی جس میں کمیونسٹ نظریہ رکھنے والوں کے ساتھ ساتھ غیر اشتراکی قلم کاروں کی شرکت اور عملی حصے کے لیے تمام امکانات روشن رکھے گئے تھے، چنانچہ ''سندھی ادبی سنگت'' کے پہلے ہی جلسے میں شیخ ایازؔ نے اپنی مشہور نظم 'باغی' پیش کی تھی۔ وہ تحریکِ آزادیِ ہند کے عروج کا زمانہ تھا، چنانچہ شیخ ایازؔ کی نظم کی دھوم پورے سندھ میں مچ گئی۔ ہر چند سندھ میں ترقی پسند ادب کی تنظیم یعنی 'سندھی ادبی سنگت' ۱۹۴۴ء میں قائم ہوئی تھی، لیکن کامریڈ سوبھو کے مطابق تخلیقی سطح پر ترقی پسندی کے بنیادی عناصر یعنی حقیقت پسندی، عوام کے دُکھ درد کا احساس، انسان دوستی، مذہبی اور تہذیبی رواداری، حب الوطنی اور امن پسندی جیسی خصوصیات سندھی معاشرے اور ادب و شاعری میں داخل رہی ہیں جن کی روشن تر

مثالیں حضرتِ شاہ عبداللطیف بھٹائی، سچل سرمست اور چین رائے سامی جیسے کلاسیکی شعرا کے ہاں سے پیش کی جاسکتی ہیں۔

کامریڈ سوبھو نے اِس باب میں اپنے نقطۂ نظر کا بڑی وضاحت کے ساتھ یعنی ترقی پسند رجحانات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''سندھی ادب کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اِس میں شروع ہی سے ترقی پسندانہ تصورات اور خیالات کا اظہار ہوتا رہا ہے اور جس کی اعلیٰ ترین مثال شاہ عبداللطیف بھٹائی کی شاعری کی دی جاسکتی ہے کہ اُنھوں نے اپنی شاعری میں جن اقدار کو ابھارا ہے، اُن کا تعلق نفیِ ذات سے نہیں بلکہ زندگی کے اثرات اور ارتقا سے عبارت ہے جو ہر دور، ہر معاشرے اور ماحول میں یکساں طور پر اہمیت رکھتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ شاہ عبداللطیف بھٹائی کے کلام کے تاثیر ہر نسل اور ہر عہد میں نہ صرف قائم چلی آتی ہے بلکہ اُس میں اضافہ ہوتا چلا گیا ہے۔ شاہ صاحب ہر زمانے کے مقبول ترین شاعر رہے ہیں۔ یہ بات بھی حقیقت ہے کہ شاہ عبداللطیف بھٹائی نے اپنی شاعری میں جو تشبیہات اور استعارے استعمال کیے ہیں اور جن کرداروں کی تمثیل کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے، وہ سب کے سب اُنھوں نے اپنے عہد اور ماحول سے منتخب کیے تھے لیکن اُن کی پیش کش اور معنویت میں ایسی آفاقیت ہے کہ اُسے ہم ہر زمانے اور عہد سے وابستہ پاتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ جہاں ایک طرف شاہ لطیف کی شاعری ترقی پسند عناصر کا شاہکار ہے، وہیں آفاقی اقدار کی امین بھی ہے''۔

شاہ لطیف کی شاعری میں مذہب اور اسلام کے پرچار کے حوالے سے کامریڈ سوبھو نے کہا:

''چونکہ مذہب بھی زندگی کی ایک اہم حقیقت اور سچائی کا نمایندہ ہوتا ہے اس لیے لطیف نے مذہب سے بھی اُن بلند اور آفاقی قدروں اور سچائیوں کو اپنی شاعری میں سمولیا ہے جن سے عالم گیر محبت کا اظہار ہوتا ہے اسلام کا تصورِ وحدت الوجود جو شاہ لطیف کو مرغوب رہا ہے، کثیر الخدائی تصور کے مقابلے میں ایک ترقی پسند نظریہ ہے جو ایک اعلیٰ اور بلند آدرش سے عبارت ہے، جس سے پیدا ہونے والی سچائی، حُسن اور نغمگی نے شاہ کی شاعری کو لازوال بنا دیا ہے۔ یعنی ایک خدا کے ماننے والے سب انسانوں کے درمیان برابری اور مساوات کا تصور ایک ایسے معاشرے کی بشارت دیتا ہے جس میں کوئی ناہمواری نہ ہو، نہ کوئی بالاتر ہو اور نہ کوئی کم تر، سب کے ساتھ یکساں معاشی و معاشرتی انصاف برتا جائے کسی خاص فکر، مذہب، فلسفے اور طبقے کو کسی دوسرے فلسفے، مذہب، فکر اور طبقے پر اجارہ داری حاصل نہ ہو۔ اِسی طرح سچل سرمست بھی ترقی پسند فکر اور رویے کا اہم ترین نمایندہ اور علم بردار شاعر ہے، بلکہ سچل سرمست نے کھل کر مذہبی کٹرپن، تنگ نظری اور تعصب کے خلاف اعلانِ جنگ کو عین مذہب قرار دیا ہے اور واشگاف انداز میں ثابت کیا ہے کہ 'ملائیت کا اسلام' اور 'صوفی کا اسلام' دو جداگانہ اسلوب اور فلسفۂ زندگی ہیں کیونکہ ملا کا مذہبی پرچار پیشہ ورانہ عمل کے مترادف ہے جو اسلام کے نام کو حاکمِ وقت کی خدمت گزاری کے لیے استعمال کرتا ہے اور اُن کی ہی

ضرورت کے مطابق اسلامی احکام کی تاویل اور تشریحات پیش کرتا ہے
جن کا اسلام کی اصل روح کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں۔ اِس کے برعکس
صوفی کے اسلام کی بنیاد ہی انسانوں کے درمیان محبت اور احترام پر رکھی
گئی ہے کہ مذہبی معاملات میں کسی بھی قسم کے جبر و زبردستی کی اسلام میں
شدید طور پر نہ صرف مذمت کی گئی ہے بلکہ اِسے ممنوع قرار دیا گیا ہے''۔

اوپر بیان ہو چکا ہے، کامریڈ سوبھو کی فکری زندگی اور شعور کے ارتقائی مراحل میں
مارکسزم کے نظریے کی حیثیت ایک مشعلِ راہ کی رہی ہے۔ اُنھوں نے اپنے ایک انٹرویو
میں مارکسزم سے اپنی وابستگی کا وسیلہ انقلابِ روس (۱۹۱۷ء) کو بتاتے ہوئے کہا ہے:

''میں مارکس، لینن اور روسی انقلاب کو عالمی نجات دہندہ تصور کرتا
ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اگر روس میں سوشلسٹ انقلاب برپا نہ ہوتا تو
سامراجیت دنیا کے مظلوم عوام کو وہ تھوڑی بہت سہولتیں اور مراعات بھی
نہ دیتی جو اُنھیں سوشل ریفارم اور اجتماعی بہبود کے نام پر خود سرمایہ دار
معاشروں میں حاصل ہوئی ہیں۔ دوسری جنگِ عظیم میں فسطائیت اور
سامراجیت کو جو شکستِ فاش ہوئی اور کرۂ ارض پر انسانی تہذیب اور
معاشرت جس طرح محفوظ ہوگئی، وہ روس کے دو کروڑ سے زائد شہریوں کی
قربانیوں کا نتیجہ ہے۔ جنگ بازی کا جنون اور قتل و غارت گری اور تباہی و
بربادی ہی کا حاصل تھا کہ دنیا بھر کے مظلوم اور امن پسند عوام مارکسزم
اور سوشلزم کو تاریخ کی آخری پناہ گاہ تصور کرنے لگے تھے۔ چنانچہ روس
کے انقلاب نے دنیا کی محنت کش تنظیموں کو ایک نیا حوصلہ بخشا اور

استحصال کے خلاف جد و جہد کی راہ دکھائی اور روسی انقلاب چین اور کیوبا
کے انقلاب کے لیے پیشہ خیمہ ثابت ہوا اور دنیا میں صدیوں سے قائم
نوآبادیاتی نظام کی جڑیں اکھاڑ پھینکنے کے لیے جو عوامی اور جمہوری تحریکیں
چلیں اُنھوں نے بھی انقلابِ روس سے روشنی اور تقویت حاصل کی تھی"۔

کامریڈ سوبھوگیان چندانی، جیسا کہ ابتدائی سطور میں کہا گیا ہے، وہ جامع الصفات
اور کثیرالجہات شخصیت کے مالک ہیں جن کی توقیر اور پذیرائی کا دائرہ وقت کے ساتھ
وسیع تر ہوتا گیا ہے۔ وہ پاکستان اور ہندوستان کے بائیں بازو کے حلقوں اور ترقی پسند
مکاتبِ فکر کے حامل اہلِ دانش اور قلم کاروں میں ایک بے حد محترم اور معتبر نام ہیں
اُن کے کچھ معاصرین کی آرا کتابِ مذکورہ کے آخری باب میں دی گئی ہیں۔ اُن میں
سے چند اہم آرا نذرِ قارئین ہیں جن کو پڑھ کر اندازہ ہوگا کہ اُن کی شخصیت کی عظمت کا
اعتراف اُن کے معاصرین نے کن الفاظ میں کیا ہے:

"کچھ مدت ہوئی پاکستان کے ایک معروف سیاست داں جنھیں
برٹرنڈ رسل اور سارتر جیسے لوگوں کے ساتھ کام کرنے کا شرف حاصل ہو چکا
تھا، میری ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ لاڑکانہ جا رہے ہیں۔ سکھر میں کسی
نے اُن سے پوچھا، 'کیا موئن جودڑو دیکھنے لاڑکانہ جا رہے ہیں؟' اُنھوں نے
جواب میں کہا، 'میں موئن جودڑو سے زیادہ عظیم زندہ حقیقت سے ملنے
لاڑکانہ جا رہا ہوں جس کا نام سوبھوگیان چندانی ہے' "۔ (شیخ ایاز)

☆

"ہر دور اپنے بطن سے ایسے نادر افراد پیدا کرتا ہے جو اپنے شعور اور
عملی کردار کے ذریعے نہ صرف اپنے عہد اور ماحول کو متاثر کرتے ہیں بلکہ

وسیع تر سماج اور تاریخ پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اکثر پورا عہد ہی اُن غیر معمولی افراد سے منسوب کیا جانے لگتا ہے، اُن افراد میں سوبھو گیان چندانی کا نام شاملِ فہرست ہے"۔ (محمد ابراہیم جویو)

☆

"ایک مہارشی مہاراج ہمالیہ کی کسی گھاٹی میں گھنے درخت تلے برسوں سے ریاضت اور تپسیا میں مگن تھے۔ اُنھیں تو صرف یہ خبر تھی کہ ہمالیہ دنیا کا سب سے اونچا پہاڑ ہے اور جس پہاڑ کی گھاٹی میں وہ تپسیا کر رہے ہیں وہ ہمالیہ کی بلند ترین چوٹی ہے۔ ایک دن ریاضت کرتے کرتے اُنھوں نے ہمالیہ کی چوٹی کی طرف نگاہ کی تو دیکھا کہ ہمالیہ سے پرے بھی پہاڑ کی ایک چوٹی ہے جو ہمالیہ سے بھی بلند ہے۔ اُنھیں بہت تعجب ہوا۔ اُنھوں نے گرو سے پوچھا، 'مہاراج! کیا ہمالیہ سے بھی بلند کوئی چیز ہوتی ہے؟' گرو نے جواب دیا، 'ہاں! انسان'۔ سرزمینِ سندھ میں جب ہم اُس بلند تر آدمی کو تلاش کرتے ہیں تو ہماری نگاہ سوبھو گیان چندانی پر آکر ٹک جاتی ہے"۔ (پروفیسر ڈاکٹر ایاز قادری)

سید مظہر جمیل کی مذکورہ کتاب کا مسودہ میں نے کامریڈ سوبھو گیان کی خدمت میں پیش کیا تھا جنھوں نے توجہ سے پڑھنے کے بعد یعنی چند دنوں کے بعد اپنے تاثرات سے مجھے آگاہ کیا تھا جس میں دلی مسرت کا عنصر غالب تھا۔ سید مظہر جمیل کی مذکورہ کتاب اپنی جامعیت اور تفہیمِ ذات وصفات کے حوالے سے ایک یادگار دستاویز ہے۔

# موہن جو دڑو کا آدمی

عظیم سندھ کا فرزندِ ارجمند و عظیم
عظیم سندھ کا بطلِ جلیل ، ضربِ کلیم
وہ ارضِ سندھ کی دانش کا ترجمان و نقیب
وہ علم و فن کا سمندر ، گیان کا سورج
وہ روحِ سندھ کی آوازِ شعلہ و شبنم
وہ روحِ سندھ کی اقدارِ حریت کا امیں

ضمیرِ وقت کی آواز ، روحِ عصر کا کرب
سمیٹے دامنِ دل میں نہ جانے کب سے تھا
حصارِ جبر و ستم میں ، دکھوں کی بستی میں
جلائے شمعِ قلم ہم کلام شب سے تھا
وہ اپنے وقت کا منصور ، حرفِ حق کا نقیب
صلیبِ وقت پہ فائز وہ شخص کب سے تھا

ہمالہ فکر و نظر کا ، شعور کا ساگر
وہ ارضِ سندھ کا سقراط و گوتم و نانک
وہ اپنی ذات میں تھا دیوتا اجالوں کا
وہ ایک جامع اللغات تھا حوالوں کا
وہ آسمانِ محبت کا مہرِ عالم تاب
وہ روشنی کا مسافر ہے آج محوِ خواب

وہ بیٹا سندھو ندی کا ، ندی کی موجوں میں
رواں دواں ہے تاحدِ نظر کرن صورت
ہماری آنکھوں سے اوجھل وہ دیوتا نہ ہوا
نگاہ و دل میں بسا ہے وہ خیر کی صورت
وہ ایک شخص جسے مشعلِ نوا کہیے
وہ ایک شخص جسے نور کا عصا کہیے

کامریڈ شانتا بخاری

# خراجِ عقیدت

ایک تصویر ذہن پہ ابھری
فکر و دانش کی ، دردمندی کی
رشتۂ درد کی ، محبت کی
سرخ روئی کی ، سربلندی کی

ایک پیکر خیال میں ابھرا
آگہی کا ، شعور کا پیکر
ایک پیمانِ وفا کا پیکر
سوزِ جاں کا ، خلوص کا پیکر

نقش اک لوحِ وقت پر ابھرا
اعتبارِ حیات کا اک نقش
خندہ زن کربِ ذات کا اک نقش
حُسنِ یزداں صفات کا اک نقش

خواب اپنے ہیں خواب سب اُس کے
رشکِ فردوسِ زندگی کا خواب
دامنِ چشم میں خوشی کا خواب
گھُپ اندھیروں میں روشنی کا خواب

# کامریڈ شانتا بخاری

ایک عظیم فقیدالمثال شخصیت کامریڈ سید جمال الدین بخاری کی فقیدالمثال جیون ساتھی کامریڈ شانتا بخاری ۲۵ جولائی ۲۰۱۴ء کو اِس دارِ فانی سے کوچ کر گئیں اور اپنے عظیم جیون ساتھی کی ہم سائیگی میں یعنی لاڑکانہ کے تاریخی قبرستان قائم شاہ بخاری میں ابدی نیند کے آغوش میں چلی گئیں۔ کامریڈ شانتا بخاری اپنے عظیم جیون ساتھی کی صرف جیون ساتھی ہی نہیں تھیں بلکہ اُن کے مشن، اُن کے آدرش، اُن کی انقلابی تحریک اور اُن کی ہمہ جہت جدوجہد کی بھی کُل وقتی ساتھی اور ہم سفر تھیں۔ وہ محنت کشوں کے CAUSE کی ایسی مجاہدہ تھیں جس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ میں تو کامریڈ شانتا بخاری کو وہی منصب دینے کے حق میں ہوں جو کامریڈ کارل مارکس کی محبوبہ جیون ساتھی فینی کا تھا۔ یہاں یہ بات واضح کر دوں کہ کامریڈ سید جمال الدین بخاری مارکس وادی تھے، وہ مارکس کے پیروکار اور اُن کے فکر و فلسفہ اور نظریے کے پرچارک تھے۔ کارل مارکس کے وہ مذہبی معنوں میں نہیں

بلکہ سائنسی کے معنوں میں معتقد اور مقلد تھے، لہٰذا کارل مارکس کی بیوی کے حوالے سے کامریڈ سید جمال الدین بخاری کا حوالہ اِسی تناظر میں دیکھا جانا چاہیے۔

میں لاڑکانہ کو اپنی پریم بھومی اور گیان بھومی کہتا ہوں۔ اِس پریم بھومی اور گیان بھومی کی جن شخصیات نے میری فکر و نظر پر گہرے اثرات مرتب کیے، اُن میں زیرِ نظر کتاب 'لاڑکانہ کے چہار درویش' کے علاوہ کامریڈ شانتا بخاری کا نامِ نامی سرِفہرست ہے وہاں کی کچھ اہم دیگر شخصیات بھی ہیں جنھوں نے لاڑکانہ کی سماجی، ثقافتی اور سیاسی زندگی کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا جن میں مرحومہ ڈاکٹر بیگم اشرف عباسی اور مرحومہ بیگم سکینہ عتیق الزماں اہم ترین حوالے کا درجہ رکھتی ہیں۔ اِن شخصیات سے میری نیازمندی رہی۔ مرحومہ ڈاکٹر بیگم اشرف عباسی سیاست میں آنے سے پہلے لاڑکانہ کی معروف ترین ڈاکٹر تھیں، چنانچہ میرا اُن سے پہلا رابطہ بحیثیت فیملی ڈاکٹر کے استوار ہوا اور میری دو بیٹیوں کی ولادت اُن کے ہاتھوں ہوئی۔ جب پیپلز پارٹی میں وہ سرگرمِ عمل ہوئیں تو میرا رابطہ چونکہ بحیثیت جزو وقتی صحافی کے المرتضیٰ سے قائم ہو چکا تھا اور فکری طور پر بھی پاکستان پیپلز پارٹی کا منشور اور ایجنڈا میری ترقی پسندانہ سوچ کے عین مطابق تھا، لہٰذا پیپلز پارٹی کے آغازِ سفر ہی سے میری اِس جماعت سے فکری اور عملی دلچسپی رہی جس کے نتیجے میں جماعت کے اہم ترین قائدین سے میرے رابطے استوار ہوئے، خود قائدِ عوام سے میری قربت سے اہلِ لاڑکانہ بخوبی واقف ہیں۔ اِس پس منظر میں ڈاکٹر صاحبہ سے میری وابستگی اور عقیدت کا معاملہ ناقابلِ فہم نہیں ہونا چاہیے۔ مرحومہ بیگم سکینہ عتیق الزماں جو تحریکِ پاکستان کے ایک اہم رہنما چوہدری خلیق الزماں کی بڑی بہو تھیں، لکھنؤ کی تہذیب و ثقافت اور روایات اُن کو ورثے میں ملی تھیں۔ لاڑکانہ کی مشہور و معروف ادبی تنظیم 'بزمِ ادب لاڑکانہ' کی وہ صدر رہیں، اور ۱۹۶۷ء میں لاڑکانہ اسٹیڈیم میں انقلابِ اکتوبر ۱۹۱۷ء کی عوامی سطح پر منعقد ہونے والی گولڈن جوبلی کی تاریخی تقریب

جس میں سابق سوویت یونین کے اُس وقت کے کونسل جنرل استولکن ایک بڑے وفد کے ساتھ شریک ہوئے، اُس تقریب کی تیاری اور انتظامات کے لیے کئی مہینے پہلے لاڑکانہ میں 'پاک سوویت کلچرل سوسائٹی' کا قیام عمل لایا گیا تھا، اُس کی صدر مرحومہ بیگم سکینہ عتیق الزماں تھیں۔

کامریڈ شانتا بخاری کی پوری زندگی جد وجہد سے عبارت تھی اور لاڑکانہ میں وہ اپنے جیون ساتھی کی طرح بے حد فعال اور لاڑکانہ کی سماجی سرگرمیوں میں پیش پیش رہتی تھیں۔ اُن کی کتابِ زیست پر طائرانہ نگاہ ڈالنے کے لیے کچھ کوائف حاصل ہوئے ہیں جو نذرِ قارئین ہیں۔

کامریڈ شانتا بخاری ۲۹ ر اکتوبر ۱۹۲۲ء کو راجستھان کے ایک گاؤں بوتھا بونڈی میں پیدا ہوئیں۔ اور بیان ہو چکا ہے کہ ۹۰ سال کی عمر میں جولائی ۲۰۱۴ء میں کراچی میں اُن کا انتقال ہوا اور وہ لاڑکانہ میں ابدی نیند سو رہی ہیں۔ گزرے وقتوں نے احمد آباد (ہندوستان) کے ایک قصبے جھالا واڑ میں ایک محنت کش لڑکی شانتا کو دیکھا جو کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا (CPI) کے نظریات سے متاثر تھی اور ٹکسٹائل ملز احمد آباد کے کارکنوں کے ساتھ پارٹی کے لیے سرگرمِ عمل تھی۔ شانتا کی والدہ اُس کے بچپن میں فوت ہوگئی تھیں اور اُس کی نانی پرورش کر رہی تھیں۔ ذرا سا ہوش سنبھالنے پر شانتا کی خودداری نے یہ گوارا نہ کیا کہ وہ کسی پر بوجھ بنی رہے، لہٰذا اُس نے اپنی چہیتی خالہ کے ساتھ ٹکسٹائل مل میں ملازمت کر لی۔ شانتا کے خالو جگن خان کامریڈ جمال الدین بخاری کے ساتھ کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم کارکن تھے۔ اُنھوں نے کامریڈ کو احساس دلایا کہ اُن کی عمر تینتالیس سال کی ہو چکی ہے، سیاست بہت ہو چکی، اب گھر بھی بسا لینا چاہیے۔ ایک روز وہ جگن خان کے گھر مدعو تھے جہاں اُن کی اہلیہ امینہ کے ساتھ اُن کی بھانجی شانتا سے بھی ملاقات ہوئی۔ خالہ اور بھانجی دونوں کچھ عرصے قبل اسلام قبول کر چکی تھیں اور

شانتا اب 'زیب النسا' تھیں۔ جگن خان کے توجہ دلانے پر بخاری صاحب زیب النسا سے شادی کرنے پر آمادہ ہوگئے اور ۱۹۴۳ء میں اٹھارہ یا اُنیس سالہ زیب النسا کامریڈ جمال الدین بخاری کے نکاح میں آگئیں۔ بخاری صاحب کا تعلق ایک جاگیردار گھرانے سے تھا، لیکن ایک کارکن سے شادی پر اُنھیں ہمیشہ فخر ہی رہا، کیونکہ زیب النسا جیسی شریکِ حیات پاکر اُنھیں غمِ زمانہ کی گئی ذمہ داریوں سے نجات مل گئی تھی۔ زیب النسا ہر لمحہ، ہر قدم، ہر منزل اُن کی ہم راہی تھیں۔ شادی کے بعد بخاری صاحب اپنی اہلیہ کے ساتھ کراچی منتقل ہو گئے جہاں لائٹ ہاؤس سنیما کے مقابل بندر روڈ پر پارٹی کا دفتر واقع تھا، بس وہیں بسیرا ہو گیا۔ پارٹی کا دفتر کمیون کارکنوں کی بیٹھک اور تربیت گاہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ زیب النسا کے یہاں آنے سے وہاں بیٹھنے والوں کو ملباری کے کھانوں سے نجات مل گئی اور مزے دار پکے ہوئے کھانے دسترخوان کی زینت بننے لگے۔ بخاری صاحب کے طرزِ زندگی میں بھی خوش گوار تبدیلی آگئی تھی، ہفتہ ہفتہ بھر ایک ہی لباس پہننے والے کامریڈ کو روزانہ دھلے اور استری کیے کپڑے ملنے لگے۔

زیب النسا کمیون کا انتظام سنبھالنے کے ساتھ پارٹی کے اخبارات کی چھپائی اور اُن کو سرِعام فروخت کرنے میں بھی کارکنوں کے ساتھ بلکہ پیش پیش ہوتی تھیں۔ اِسی دوران میں ایک روز اخبار بیچنے نکلیں تو گروپ سے کچھ پیچھے رہ گئیں۔ سڑک پر پولیس نے لڑکوں سے اخبارات چھین لیے اور بحث ومباحثہ بھی ہوا۔ زیب النسا نے موقع پر پہنچ کر نہ صرف اخبارات واپس دلائے بلکہ افسر کو قائل کرکے ایک اخبار اُس کے ہاتھ بیچ بھی دیا۔ افسر نے سوال کیا، ''یہ اخبار کیوں بیچتے ہو؟'' جواب ملا، ''خرچا چلانے کے لیے''۔ حقیقت بھی یہی تھی کہ اُس آمدنی ہی سے تمام اخراجات چلتے تھے۔

کمیونسٹ پارٹی کے کارکن سفید سادہ سی ساری میں ملبوس مہربان، مشفق اور خدمت گار زیب النسا کو ایک بلند پایہ رہ نما بلکہ ماں کی حیثیت سے دیکھتے تھے۔

۱۹۴۶ء میں جبکہ وہ دو بچوں مظفر سلطان بخاری اور مظہر سلطان بخاری کی ماں بن چکی تھیں، کمیونسٹ پارٹی پر پابندی عائد ہوگئی، دفتر/کمیون بند ہوگیا، سرگرم کارکن سوبھوگیان چندانی سمیت کئی کامریڈوں کے ساتھ بخاری صاحب بھی گرفتار ہو گئے جیل جانا بخاری صاحب کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی، لیکن دو بچوں کے ساتھ بے سروسامانی اماں زیب النسا کے لیے کڑا امتحان تھا۔کمیون کے بند ہو جانے کے بعد وہ اپنے بچوں اور سوبھوگیان چندانی کی بیوی کے ساتھ آرام باغ کے قریب واقع قاضی مینشن کے ایک فلیٹ میں منتقل ہوگئی تھیں۔

بچپن سے محنت مشقت سے جی نہ چرانے والی کامریڈ زیب النسا نے اُس وقت بھی حوصلہ نہ ہارا اور انسانیت کے علم بردار نوجوان کارکنوں کی خدمت اور سرپرستی کے ساتھ ساتھ دو معصوم بچوں کو اٹھائے شوہر کی رہائی کے لیے سرکاری دفاتر کے چکر لگانے شروع کردیے۔کبھی وہ وزیرِاعلیٰ سندھ پیر الٰہی بخش، چیف سکریٹری این۔اے۔فاروقی کے دفتر اور کبھی سکریٹری داخلہ ہاشم رضا کے دفتر جاتیں، اُن سے ملاقاتیں کرتیں اور شوہر کی رہائی کے لیے درخواست کرتیں۔حکومت سے اُن کا مطالبہ بھی کچھ عجیب و غریب تھا کہ ”مجھے میرے بچوں سمیت جیل میں بخاری صاحب کے ساتھ بند کر دیا جائے یا پھر حکومت ہمارا خرچا اٹھائے“۔ مہینے میں ایک بار بخاری صاحب سے جیل میں ملاقات کی اجازت ملتی تھی، تاہم ہر تین ماہ بعد سزا میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔

ڈھائی سال کی تگ و دو کے نتیجے میں قاضی فضل اللہ اور آغا غلام نبی پٹھان نے بڑی دوڑ دھوپ کے بعد بخاری صاحب کی ضمانت کرادی۔بخاری صاحب کی کراچی بدری کے احکام صادر ہو گئے تھے، لہٰذا قاضی فضل اللہ اِس خاندان کو لاڑکانہ لے گئے اور جب تک اُن کے لیے گھر کا بندوبست نہ ہوا بخاری صاحب قاضی صاحب کے گھر میں

قیام پذیر رہے۔ کامریڈ زیب النسا نے بخاری صاحب کی رہائی کے لیے قاضی فضل اللہ اور آغا غلام نبی پٹھان سے رابطہ رکھا ہوا تھا جنھوں نے یوسف ہارون سے مل کر اُن کی رہائی کی درخواست کی، چنانچہ مرکزی وزیرِ داخلہ خواجہ شہاب الدین سے رابطے کے بعد مسئلہ حل ہوا۔ حوصلہ مند اہلیہ ہر لمحہ بخاری صاحب کے شانہ بشانہ برسرِ پیکار تھیں پاکستان چوک لاڑکانہ کے قریب موجود 'انصاف پرنٹنگ پریس' میں عبدالغفور بھرگڑی اور قاضی عبدالمنان کی شراکت میں کام شروع کیا۔ مذکورہ پریس کی مشین اور دیگر اشیا آج بھی 'بخاری منزل' لاڑکانہ میں موجود ہیں۔ بعدِ ازاں دونوں کی شراکت ختم ہوگئی اور بخاری صاحب نے تادمِ مرگ اُس کو چلایا۔ کامریڈ زیب النسا نے آٹھ بیٹوں مظفر سلطان بخاری مظہر سلطان بخاری، سید منور سلطان بخاری، سید مکرم سلطان بخاری، سید معظم سلطان بخاری سید کمال الدین بخاری، سید ناصر شاہ بخاری اور سید زین المجاہدین بخاری اور بیٹی ڈاکٹر مہر النسا کی تعلیم و تربیت کی۔ ۱۷ر دسمبر ۱۹۸۴ء میں سید جمال الدین بخاری نے کامریڈ زیب النسا کو تمام ذمہ داریاں تنہا سونپ کر جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی اور درگاہِ حضرتِ قائم شاہ بخاری میں دفن ہوئے۔

بخاری صاحب کے بعد کامریڈ زیب النسا نے تمام بچوں کی ہدایت اور رہ نمائی کو اپنا معمول بنا لیا اور اللہ تعالیٰ کی عبادات میں مشغول ہوگئیں۔ کبھی وہ لاڑکانہ اور کبھی کراچی میں مقیم بیٹوں کے پاس قیام کرتیں۔ آخرش ۲۵ر جولائی ۲۰۱۴ء کو وہ اپنے شریکِ حیات سے جا ملیں۔ وہ خواتین کے لیے انسانوں سے محبت، محنت، مشقت اور جد و جہدِ زندگی میں بھرپور کردار ادا کرنے کے سلسلے میں ایک قابلِ تقلید مثال چھوڑ گئی ہیں۔

# اکبر خان کیانی

## حرفِ آخر

قدرت کے عدم و وجود اور اثبات و نفی کی بوقلمونی کے جوہر سے کشیدہ نور و ظلمت کی ستیزہ کاری اِس کائنات کے عجیب وغریب اضدادی جمال کا پرَتو ہے۔ ہر دور میں انسانی مجد و شرف کے داعی استحصال واستعمار کی طاغوتی طاقتوں سے معروفِ پیکار رہے ہیں، لیکن دار وگیر اور شکست و غلامی کے اندھیروں میں بھی روشن فکری کے چراغ، جو روحِ انقلاب کا سرچشمہ ہیں، لَو دیتے رہے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب 'لاڑکانہ کے چہار دُرویش' میں اُن منتخبِ روزگار بزرگوں کا تذکرہ شامل ہے جو نہ صرف عمر بھر علم ویقیں اور حرکت وعمل کی خوشبو پھیلاتے ہیں بلکہ اپنے پیچھے روشنی کی ایسی لکیر بھی چھوڑ جاتے ہیں جس کا دوسرا سرا لازماً زندگی کی افضل ترین قدروں اور سربلند آدرش کی چوٹیوں تک پہنچتا ہے، کیونکہ ''چراغِ مقبلاں ہرگز نمیرد''۔

کتاب میں شامل کامریڈ سید جمال الدین بخاری، کامریڈ حیدر بخش جتوئی، کامریڈ مولوی نذیر حُسین جتوئی اور کامریڈ سوبھوگیان چندانی ایسی انقلابی شخصیات کی زندگی محض اپنے مخصوص نظریات اور آدرش کی پاس داری سے عبارت نہ تھی بلکہ جہد و عمل کے میدان میں تحرک پذیری کی علم بردار بھی رہی؛ تعقل پسندی، روشن خیالی اور سائنسی اندازِ فکر کے دوش بدوش تہذیبی روایت کا رچاؤ اِن اصحابِ قول و قرار کے ہاں ملتا ہے جس نے اِن کی شخصیت کو متنوع اور طلسماتی کر دینے کے ساتھ اِن کے مزاج میں قوسِ قزح کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ جامد و ساکت خیالات نہ تو اِن قدآور شخصیات کو قبول تھے اور نہ کبھی یہ منجمد و بے عمل ادعائیت کی وکالت میں ملوث ہوئیں۔ اِن کی فکری اساس تاریخی بصیرت اور منطقی استدلال سے عبارت تھی۔ دیومالائی اعتبار کا حامل یہ گروہِ دانش وراں جس بات کو درست و جائز سمجھتا، اُس کے اظہار اور تعمیل میں کبھی متردد نہیں ہوا۔

مجموعی طور پر علمی وجاہت و فکری ذہانت اور تخلیقی جدت وجودت سے مملو زیرِ تذکرہ شخصیات اپنی آفاقیت اور ہمہ جہتی کے اعتبار سے اِس قدر کثیر الاطراف ہیں کہ اِن کی گہرائیوں اور پہنائیوں کو چند سطور میں سمیٹ لینا حدِ امکاں سے ماورا ہے۔ میں نے اِس نوعیت کی اسقاطی کوشش اس لیے کی ہے کہ دنیائے ادب کے معروف و کہنہ مشق نظم و نثر نگار، متفرق ادبی انجمنوں، تنظیموں اور رسائل و جرائد کے رکنِ رکین اور عصرِ حاضر میں تعقل پسند و خرد افروز ترقی پسندی کی نمائندہ شخصیت مسلم شمیم صاحب نے اِن سرکردگانِ فکر اور ذہنِ جدید کے وقائع نگار پر کتاب تصنیف کر کے جبر و استحصال کی اِس مہیب تاریکی میں محرابِ فکر کو روشن رکھنے کی سعیِ بلیغ کر دی ہے۔ کتابِ ہٰذا کی طباعت و اشاعت کے ذریعے اُن کے اِس کارِ افتخار میں شرکت سے میں بھی معزز ہوں۔

امید واثق ہے کہ اشاعتِ اوّل کے وسیع پیمانے پر خیر مقدم و استقبال کے بعد کتاب کی اشاعتِ ثانی کو زیادہ قبولیت و پذیرائی حاصل ہوگی، کیونکہ ''نقاشِ نقشِ ثانی بہتر کشد زِ اوّل''۔

# کوائف

| | |
|---|---|
| نام: | محمد مسلم |
| قلمی نام: | مسلم شمیم |
| والد کا نام: | محمد ناظر حُسین (مرحوم) |
| والدہ کا نام: | شرف النسا (مرحومہ) |
| جائے پیدائش: | ولی پور، پٹنہ (عظیم آباد)، پاٹلی پتر |
| تاریخِ پیدائش: | ۳ر جنوری، ۱۹۳۹ء |
| بیگم اور بچے: | عصمت شمیم بنتِ سید محمد لئیق (مرحوم)، خالد شمیم (انجینئر) شاہد شمیم (انجینئر)، عفت ریاض، سیمی شاہد، نازیہ عتیق شاد شمیم (پوتا)، خضر شمیم (پوتا)، اشعر شمیم (پوتا)، آرسن شمیم (پوتا)، ثنا ریاض (نواسی)، ماہین (نواسی)، عمر عتیق (نواسہ)، سدرہ ریاض (نواسی)، دعا شاہد (نواسی) عبد الباسط (نواسہ)، عبد الواسع (نواسہ) سمرا (پوتی)، آدریان شمیم (پوتا)، علینہ شمیم (پوتی) |
| تعلیمی زندگی: | بی۔اے آنرز (سیاسیات)، پٹنہ یونیورسٹی، ۱۹۵۶ء ☆ایم۔اے (سیاسیات)، کراچی یونیورسٹی، ۱۹۵۹ء ☆ ایم۔اے (اردو ادبیات) سندھ یونیورسٹی، ۱۹۶۷ء ☆ ایل ایل۔ بی سندھ یونیورسٹی، ۱۹۷۳ء |
| معاشی تگ ودو: | لکچرر (سیاسیات)، لاڑکانہ کالج آف کامرس اینڈ اکنامکس ۱۹۶۱ء۔۱۹۷۲ء ☆ پروفیسر، سینٹ پیٹرکس کالج کراچی ۲۰۰۷ء۔۲۰۰۸ء ☆ وزٹنگ پروفیسر، پاکستان اسٹڈی سنٹر جام شورو سندھ یونیورسٹی ۲۰۰۵ء۔۲۰۰۶ء<br>ڈائرکٹر/ جنرل منیجر، سوویت پریس انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ کراچی ۱۹۷۲ء۔۱۹۷۸ء<br>وکالت: ۱۹۷۸ء تا حال |

جز وقتی صحافت: نمایندۂ اے پی پی لاڑکانہ، ۱۹۶۳ء۔۱۹۷۰ء
نمایندۂ روزنامۂ جنگ کراچی، لاڑکانہ، ۱۹۷۰ء۔۱۹۷۱ء
نمایندۂ روزنامۂ سن کراچی، لاڑکانہ، ۱۹۷۱ء۔۱۹۷۲ء
مدیرِاعلیٰ کالج میگزین المیزان اور ونجارا، لاڑکانہ، ۱۹۶۲ء۔۱۹۷۲ء
رکنِ مجلسِ ادارت: ہفت روزہ محور کراچی، ۱۹۷۸ء۔۱۹۸۰ء، سہ ماہی جامِ جم سکھر ۱۹۶۰ء۔۱۹۶۱ء
ماہ نامۂ طلوعِ افکار کراچی، ۱۹۸۹ء تا ۲۰۰۶ء
ماہ نامۂ اردو انٹرنیشنل کراچی، ۱۹۹۰ء تا ۲۰۰۶ء
تنظیمی وابستگی: سکریٹری مجلسِ ادب سکھر، ۱۹۶۰ء۔۱۹۶۱ء ☆ سکریٹری بزمِ ادب لاڑکانہ ۱۹۶۱ء۔۱۹۶۳ء ☆ سکریٹری انجمن ترقی اردو لاڑکانہ، ۱۹۶۳ء۔۱۹۷۲ء ☆ پاکستان رائٹرز گلڈ ☆ عوامی ادبی انجمن، کراچی ☆ تاحیات رکن: آرٹس کونسل آف پاکستان کراچی اور جنرل سکریٹری ترقی پسند مصنفین گولڈن جوبلی کانفرنس (۱۹۸۶ء)، کراچی ☆ سکریٹری جنرل انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان کراچی ۲۰۰۲ء تا ۲۰۰۶ء ☆ جنرل سکریٹری کونسل برائے شہری آزادی ☆ بانی، قلم برائے امن پاکستان ☆ صدرِ لاڑکانہ سنگت ۲۰۰۰ء تا حال ☆ مرکزی صدر، انجمنِ ترقی پسند مصنفین پاکستان ۲۰۱۳ء تا حال
تصانیف: امکان (شعری مجموعہ) ☆ آدرش (نثری مجموعہ) ☆ شوکت عابدی۔فن اور شخصیت (نثری مجموعہ [تالیف]) ☆ تناظر (نثری مجموعہ) ☆ بیان (شعری مجموعہ) ☆ نظریات کا تصادم (نظریاتی مضامین کا مجموعہ) ☆ فکر و فن کے جزیرے (نثری مجموعہ)
زیرِطبع: ☆ کامریڈ حیدر بخش جتوئی۔شخصیت اور شاعری (کتاب) ☆ سیکولر مفکرین، سقراط سے سبطِ حسن تک (مجموعۂ مضامین) ☆ سندھی ادبیات کے نورتن (مجموعۂ مضامین) ☆ دبستانِ لاڑکانہ کے چار مینار (مجموعۂ مضامین)
مکان: بی۔۱۸۹، سیکٹر ۱۱۔بی، گلشنِ سرسید، کراچی۔فون: ۳۶۹۴۱۶۵۹
دفتر: ۵۰۵، بلاک بی، رفیق پلازا، بالمقابل ماما پارسی اسکول ایم۔اے جناح روڈ، کراچی۔فون: ۳۲۷۲۰۲۰۵، ۳۲۷۳۲۷۳۹۱
موبائل: ۰۳۱۴۔۲۱۹۲۳۴۷

قحط زدہ معاشرے میں جہاں ہر طرف بے چینی و اضطراب کا دور دورہ ہے، بڑی مشکل سے انسانوں کو تلاش کیا جا سکتا ہے۔ یہ سماج ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو سکتا ہے صرف اس لیے کہ اچھے انسان خاموش ہو گئے ہیں یا گوشہ نشینی اختیار کیے ہوئے ہیں، لیکن کچھ لوگ ببانگِ دہل اچھائی کا پرچار کرتے ہوئے نظر آئیں گے، وہ تھوڑے ہی سہی لیکن اصل انسان کی قبا اوڑھے ہوئے ہیں۔ کسی کے بقول اگر دو قیدی سلاخوں کے پیچھے سے جھانکتے ہیں تو ایک کو کیچڑ نظر آئے گا تو دوسرے کو ستارے۔ مسلم شمیم ہمیشہ لاڑکانہ کے ستاروں ہی کی کھوج میں رہے ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ لاڑکانہ کی مردم خیز سرزمین سے چار ہیروں یا ستاروں کو یک جا کر کے ایک کتاب کی شکل میں لے آئے ہیں۔ یہ چہار درویش واقعی عظیم لوگ ہیں جنھوں نے جو شمعیں جلائیں، وہ کبھی ماند نہیں پڑیں گی۔ مسلم شمیم نے جس فن کارانہ انداز سے اُنھیں پیش کیا ہے، اُس سے لاڑکانہ کی خوشبو، امرودوں کے درختوں کی کھنکھناہٹ، چاولوں کے پکنے والی گرمی اور اِس دھرتی کی مٹی اور پانی کا پورا پورا حق ادا کر دیا ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں اِن شخصیات سے جو کچھ حاصل کیا ہے، وہ یہ طرزِ عمل ہے کہ ایمان کو سلامت رکھو، محنت کی عظمت کا اقرار کرو، کسی جابر کے سامنے سر نہ جھکاؤ، مظلوم کو گلے لگاؤ اور اپنی تاریخی و تہذیبی قدروں کو قربان نہ کرو اور اُن کی روشنی سے آنکھیں نہ چراؤ تو سر خود ہی اونچا رہے گا اور اُن سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکو گے جن کو آج اپنی طاقت، اپنی سیاست اور اپنی ترقی پر ناز ہے۔

کتاب میں شامل مضامین بہت دلچسپ، فکر انگیز اور سبق آموز ہونے کی وجہ سے انتہائی اہمیت کے حامل ہیں، ایک فلسفی اور مفکر و محقق ہی ایسا کام سرانجام دے سکتا ہے۔ ایسا شاعر جو فکر و فن کی بلندیوں کو چھو رہا ہو، اُس کے فکر و شعور کے پیچھے وہ خاندانی نجابت و تربیت ہوتی ہے جو اُسے ایک شریف النفس اور نیک طینت انسان کا تشخص عطا کرتی ہے۔ ایسا انسان نہ خود گم راہ ہوتا ہے اور نہ دوسروں کو گم راہ کرتا ہے، بلکہ وہ انسانی معاشرے کو امن و آشتی، محبت و مروت اور شرافت و پاکیزگی کا گہوارہ بنانے کا آرزو مند رہتا ہے۔ اِس کتاب میں ایسے ہی عظیم لوگوں کی مثالیں دے کر 'چہار درویش' کے نام سے پیش کیا گیا ہے جو حالات کی تبدیلی کی خواہش میں شدت اختیار کرتے ہیں، اور یہ بہت بڑی خوش آیند تبدیلی کا خواب ہے۔

مسلم شمیم کی اِس کاوش کا میں کھلے دل سے اعتراف و استقبال کرتا ہوں۔ امیدِ واثق ہے کہ اِس کتاب کو حلقۂ فکر و دانش میں قبولیت حاصل ہوگی۔

**ذوالفقار قادری**

(سابق اکاؤنٹینٹ جنرل سندھ)

لاڑکانہ کے چہار درویش

مسلم شمیم
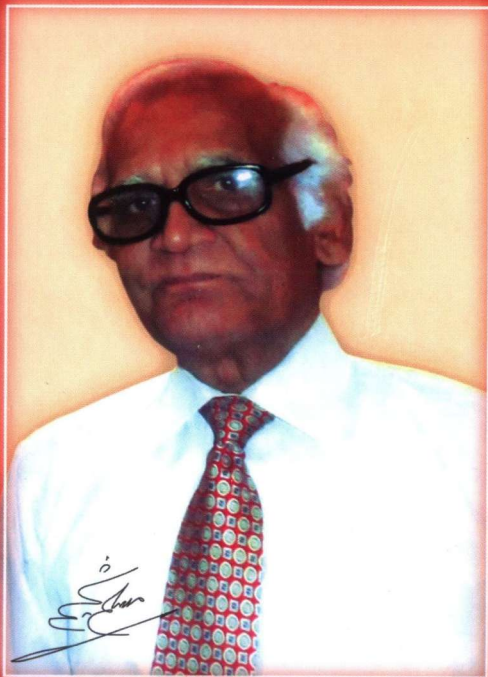
اک عمر شمیم آپ کی اِس چاہ میں گزری
تپتے ہوئے صحراؤں میں چشمہ کوئی پھوٹے

نقش
NAQSH

# پڙهندڙ نَسُل . پَ نَ

## The Reading Generation

1960 جي ڏهاڪي ۾ عبدالله حسين " اُداس نسلين" نالي ڪتاب لکيو. 70 واري ڏهاڪي ۾ وري ماڻڪَ "لُڙهندَڙ نَسُل" نالي ڪتاب لکي پنهنجي دورَ جي عڪاسي ڪرڻ جي ڪوشش ڪئي. امداد حُسينيءَ وري 70 واري ڏهاڪي ۾ ئي لکيو:

انڌي ماءُ ڄڻيندي آهي اونڌا سونڌا ٻارَ
ايندڙ نسل سَمورو هوندو گونگا ٻوڙا ٻارَ

هر دور جي نوجوانن کي اُداس، لُڙهندَڙ، ڪَڙهندڙ، ڪُڙهندڙ، ٻَرندڙ، ڇُرندڙ، ڪِرَندڙ، اوسيئڙو ڪَندَڙُ، ياڙي، ڪائُو، ياڄوڪَڙُ، ڪاوڙيل ۽ وِڙهندڙ نسلن سان منسوب ڪري سَگهجي ٿو، پَر اسان اِنهن سڀني وِچان "پڙهندڙ" نسل جا ڳولائو آهيون. ڪتابن کي ڪاڳر تان کڻي ڪمپيوُٽر جي دنيا ۾ آڻڻ، ٻين لفظن ۾ برقي ڪتاب يعنيٰ e-books ٺاهي ورهائڻ جي وسيلي پڙهندڙ نسل کي وَڌڻ، ويجهَڻ ۾ هِڪَ ٻِئي کي ڳولي سَهڪاريِ تحريڪ جي رستي تي آڻِڻَ جي آسَ رکون ٿا.

پَڙهندڙ نَسل (پَ نَ) ڪا بہ تنظيمَ ناهي. اُنَ جو ڪو بہ صدر، عُهديدار يا پايو وِجهندڙ نہ آهي. جيڪڏهن ڪو بہ شخص اهڙي دعويٰ ڪري ٿو تہ پَڪَ ڄاڻو تہ اُهو ڪُوڙو آهي. نہ ئي وري پَ نَ جي نالي کي پئسا گڏ ڪيا ويندا. جيڪڏهن ڪو اهڙي ڪوشش ڪري ٿو تہ پَڪَ ڄاڻو تہ اُهو بہِ ڪُوڙو آهي.

جَهڙيءَ طَرَح وڻن جا پَنَ ساوا، ڳاڙها، نيرا، پيلا يا ناسي هوندا آهن اَهڙيءَ طرح پڙهندڙ نَسُل وارا پَنَ بہ مختَلِف آهن ۽ هوندا. اُهي ساڳئي ئي وقت اُداس ۽ پڙهندڙ، بَرندڙ ۽ پڙهندڙ، سُست ۽ پڙهندڙ يا وِڙهندڙ ۽ پڙهندڙ بہ ٿي سگهن ٿا. بين لفظن ۾ پَنَ کا خُصوصي ۽ تالي لڳل کِلَب Exclusive Club نہ آهي.

ڪوشش اها هوندي تہ پَنَ جا سڀ ڪَم ڪار سَهڪاري ۽ رَضاڪار بنيادن تي ٿين، پر ممڪن آهي تہ ڪي ڪم اُجرتي بنيادن تي بہ ٿِين. اهڙي حالت ۾ پَنَ پاڻ هِڪَبِئي جي مدد ڪَرڻ جي اُصولَ هيٺ ڏي وَٺُ ڪندا ۽ غيرتجارتي non-commercial رهندا. پَنَن پاران ڪتابن ڪي ڊِجيٽائِيز digitize ڪرڻ جي عَملَ مان ڪو بہ مالي فائدو يا نفعو حاصل ڪرڻ جي ڪوشش نہ ڪئي ويندي.

ڪتابن کي ڊِجيٽائِيز ڪرڻ کان پو ٻيو اهم مرحلو وِرهائڻ distribution جو ٿيندو. اِهو ڪم ڪرڻ وارن مان جيڪڏهن ڪو پيسا ڪمائي سگهي ٿو تہ ڀلي ڪمائي، رُڳو پَنَن سان اُن جو ڪو بہ لاڳاپو نہ هوندو.

پَنَن کي گُليل اکرن ۾ صلاح ڏجي ٿي تہ هو وَسَ پٽاندڙ وڏِ کان وَڏِ ڪتاب خريد ڪَري ڪتابن جي ليکڪَن، ڇپائيندڙن ۽ ڇاپيندڙن کي هِمٿائِن. پر ساڳئي وقت عِلم حاصل ڪرڻ ۽ ڄاڻ کي ڦهلائڻ جي ڪوشش دوران ڪَنهن بہ رُڪاوٽَ کي نہ مڃن.

شيخ اَيازَ علمَ، ڄاڻ، سمجهَ ۽ ڏاهپَ کي گيتَ، بيتَ، سِٽ، پُڪارَ سان تَشبيهہ ڏيندي انهن سيني کي بَمن، گولين ۽ بارودَ جي مدِ مقابل بيهاريو آهي. اياز چوي ٿو تہ:

گيتَ بہِ ڄڻ گوريلا آهن، جي ويريءَ تي وار ڪَرن ٿا.

... ...

جئن جئن ڄاڙ وڏي ٿي جَڳَ ۾، هو ٻوليءَ جي آڙ ڇُپن ٿا؛

ريتيءَ تي راتاها ڪن ٿا، موٽي مَنجهہِ پهاڙ ڇُپن ٿا؛

... ...

ڪالهہَ هُيا جي سُرخ گُلن جيئن، اڄڪلهہ نيلا پيلا آهن:

گيتَ بہِ ڄڻ گوريلا آهن........

... ... ... ...

هي بيتُ اَٿي، هي بَم- گولو،

جيڪي بہ ڪٽين، جيڪي بہ ڪٽين!

مون لاءِ ٻنهي ۾ فَرَقُ نہ آ، هي بيتُ بہ بَمَ جو ساٿي آ،

جنهن رِڻَ ۾ رات ڪَيا راڙا، تنهن هَڏَ ۽ چَمَ جو ساٿي آ ـ

اِن حسابَ سان اڄ‌ڪلهہ اٽڪل ڪي پاڻ تي اِهو سوچي مَڙهڻ تہ "هاڻي ويڙهہ ۽ عمل جو دور آهي، اُن ڪري پڙهڻ تي وقت نہ وڃايو" ناداني‌ءَ جي نشاني آهي.

پَنَ جو پڙهڻ عام ڪِتابي ڪيڙن وانگر رُڳو نِصابي ڪتابن تائين محدود نہ هوندو. رڳو نصابي ڪتابن ۾ پاڻ کي قيد ڪري ڇڏڻ سان سماج ۽ سماجي حالتن تان نظر ڪڄي ويندي ۽ نتيجي طور سماجي ۽ حڪومتي پاليسيون policies اڄڪلهہ ۽ نادانن جي هٿن ۾ رهنديون. پَنَ نِصابي ڪتابن سان گڏوگڏ ادبي، تاريخي، سياسي، سماجي، اقتصادي، سائنسي ۽ ٻين

ڪتابن کي پڙهي سماجي حالتن کي بهتر بنائڻ جي ڪوشش ڪندا.

پڙهندڙ نَسُل جا پَنَ سيني کي چو، چالاءِ ۽ ڪينئن جهڙن سوالن کي هر بَيانَ تي لاڳو ڪرڻ جي ڪوشَ ڏين ٿا ۽ انهن تي ويچار ڪرڻ سان گڏ جوابَ ڳولڻ کي نہ رڳو پنهنجو حق، پر فرض ۽ اٽٽر گهرج unavoidable necessity سمجهندي ڪتابن کي پاڻ پڙهڻ ۽ وڌ کان وڌ ماڻهن تائين پهچائڻ جي ڪوشش جديد ترين طريقن وسيلي ڪرڻ جو ويچار رکن ٿا.

توهان بہ پڙهڻَ، پڙهائڻ ۽ ڦهلائڻ جي اِن سهڪاري تحريڪ ۾ شامل ٿي سگهو ٿا، بَس پنهنجي اوسي پاسي ۾ ڏِسو، هر قسم جا ڳاڙها توڙي نيرا، ساوا توڙي پيلا پن ضرور نظر اچي ويندا.

وڻ وڻ کي مون ڀاڪي پائي چيو تہ ”منهنجا ڀاءُ
پهتو منهنجي من ۾ تنهنجي پَنَ پَنَ جو پڙلاءُ“.
- اياز (ڪلهي پاتم ڪينرو)